احوال و آثار اقبالؒ

چند پہلو

ڈاکٹر محمد باقر

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ لاہور

448

صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن اللہ مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے

احوال و آثار اقبالؒ

چند پہلو

(Some Aspects of Life and Works of Iqbal)

ڈاکٹر محمد باقر

اقبال اکادمی پاکستان

۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ لاہور

جملہ حقوق بحق اقبال اکادمی پاکستان محفوظ ہیں

ناشر : ڈاکٹر محمد معزالدین
ڈائریکٹر : اقبال اکادمی پاکستان ، لاہور

طابع : سید اظہارالحسن رضوی

مطبع : مطبع عالیہ ، ۱۲۰ ٹمپل روڈ ، لاہور

طبع اول : ۱۹۸۱ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : ۱۷ روپے

مندرجات

۱- بالِ جبریل ، ۱

۲- اقبال اور مسلمان مفکر : سنائی ، ۲

۳- تقدیر امم ، ۳۱

۴- قائدین ملت——اقبال کا معیار ، ۴۴

۵- علامہ اقبال کے اجداد ، ۵۲

۶- اقبال—— جمہوریت——اسلام ، ۶۰

۷- اتحاد عالم اسلام——اقبال کی سوچ ، ۶۶

۸- اقبال کی توضیحات——بندۂ مومن کے بارے میں ، ۷۶

۹- اقبال سے دور کی ہم عصری کا شرف ، ۸۷

۱۰- تنظیم اصول مملکت داری——اقبال کے نظریات ، ۹۴

پیش لفظ

علامہ اقبالؒ کے احوال و آثار اور افکار کے مضمرات پر سیر حاصل تبصرہ کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے ایک طویل عمر اور فرصت درکار ہے ۔ سوءِ اتفاق سے یہ فقیر موزوں وقت پر ان نعمتوں کی سعادت سے محروم رہا ۔ البتہ عمر کے مختلف حصوں میں اپنی استطاعت کے مطابق اور ہیچکاری کے باوجود علامہؒ مرحوم کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر اپنی یافت کو دوسروں تک پہنچانے کی سعی میں مشغول رہا ۔ یہ مضامین اسی سعی کا نتیجہ ہیں ۔ چنانچہ ہر مضمون کے آخر میں تاریخ و مقام اشاعت کی نشان دہی کر دی گئی ہے ۔

اقبال شناسوں کے لیے شاید ان مضامین میں کوئی ندرت یا تازگی نہ ہو یا کم ہو ۔ لیکن اقبالؒ کے احوال و آثار کے بعض حصوں کو جس طالب علمانہ انداز میں زیر بحث لایا گیا ہے ، وہ طلباء کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوگا ۔ مثلاً ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کے ارشاد کی تعمیل میں اقبالؒ کے اجداد پر اصل منابع پر مبنی جو مختصر سی تحقیق پیش خدمت ہے ۔ وہ اس موضوع پر اولین کاوش ہے اور راقم کے لیے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ اس تحریر سے نہ صرف ڈاکٹر جاوید اقبال خوش ہوئے بلکہ علامہ مرحوم کی ایک دلی خواہش بھی پوری ہو گئی ۔

اقبال نہ صرف ایک مفکر اور عالم تھے ، بلکہ اپنے دورانِ حیات میں مسلمانوں کی ہر نوع کی فلاح و بہبود کی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے ۔ اس سلسلے میں وہ عوام کے جلسوں میں بھی شرکت فرماتے رہے ۔ علامہ کی زندگی کے اس رخ پر ابھی بہت سا کام کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس فقیر نے صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۲ء تک وہ موچی دروازے کے کن عوامی جلسوں میں شریک ہوئے ۔ ان جلسوں میں وہ بعض دفعہ بحیثیت مقرر تشریف لے گئے اور بعض دفعہ انھوں نے صدارت فرمائی ۔ قیاس کہتا ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی اُن سے اپنے مسائل کے لیے راہنمائی چاہی اور عوام کے جلسوں میں اُن سے شرکت کی درخواست کی تو انھوں نے انکار نہیں کیا ۔ راقم نے ان حاضریوں کی صرف مختصر روداد معاصر روزناموں سے جمع کر کے پیش کر دی ہے ۔ لیکن اگر ان کی تفصیلات فراہم ہوں تو ان سے ہندوستان میں مسلمانوں کی مختلف جہات میں اُس نبرد آزمائی کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے ، جو وہ تنازع للبقاء کے لیے اس شبہ قارہ میں کیا کرتے تھے اور جن میں اقبال برابر کا شریک و سہیم تھے ۔ یوں نظر آتا ہے جیسے مسلمانوں کی بہبود کا ہر چھوٹا بڑا مسئلہ اقبال کا اپنا مسئلہ تھا اور وہ ان مسائل میں بساط بھر دلچسپی لینا چاہتے تھے ۔ پنجاب یونیورسٹی بی ۔ اے کے نصاب میں سے ۱۹۳۲ء میں اسلامی تاریخ کو خارج کر دیتی ہے ۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ لاہور اس اقدام کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ۱۱ جون ۱۹۳۲ء کو ایک عوامی جلسہ منعقد کرتی ہے ، جس میں علامہ اقبال صدارت فرماتے ہیں اور دیگر ارشادات کے علاوہ یہ بھی کہتے ہیں : میں جب

اٹلی گیا تو میری ملاقات شہزادہ کیٹانی (Caetani) سے بھی ہوئی ۔ وہ اسلامی تاریخ کے بڑے مداح ہیں ۔ انھوں نے اسلامی تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اتنا روپیہ صرف کیا ہے کہ کوئی اسلامی ریاست ان سب کا ترجمہ کرانے کی استطاعت بھی نہیں رکھتی ۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ آپ اسلامی تاریخ میں کیوں دلچسپی لیتے ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا : ''اسلامی تاریخ کا مطالعہ عورتوں کو مرد بنا دیتا ہے'' ۔

علامہ اقبال کے اٹلی کے سفر کی دیگر جزئیات محفوظ اور معدوم ہیں لیکن پنجاب یونیورسٹی کے بی ۔ اے کے نصاب سے اسلامی تاریخ کے اخراج کے خلاف جو احتجاجی جلسہ منعقد ہوا صرف اس کی کارروائی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے مسائل سے اقبال کا کتنا شغف تھا اور یہ کہ اٹلی کے شہزادہ کیٹانی اسلامی تاریخ سے کتنے متاثر تھے ۔ مجھے اپنے عجز کا اعتراف ہے کہ میری دسترس میں وسائل اس سلسلے میں میری کمک نہیں کر سکے کہ یہ معلوم ہو جاتا کہ شہزادہ کیٹانی کون تھا اور اسلامی تاریخ سے متعلق اس کی تالیفات کون سی تھیں ۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ اقبالؒ کے احوال و آثار اور فعالیت سے متعلق ابھی تک مزید کام کرنے کی گنجایش اور ضرورت ہے اور یہ تحریریں اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں ۔

محمد باقر

۱۳ جی ، ماڈل ٹاؤن ،
لاہور

۸ جنوری ۱۹۸۱ء

بالِ جبریل

جاوید نامہ کی اشاعت کے بعد زمانہ گمان کر رہا تھا ۔ کہ شاید فکر اقبال معراج پرواز کی تحصیل سے مطمئن ہو چکا ہے ۔ اور اس سے مزید صعود کا امکان ممکن نہیں ۔ لیکن اقبال کہہ رہا تھا :

غزلے زدم کہ شاید بنوا قرارم آید
تپ شعلہ کم نگردد ز گسستن شرارہ

چنانچہ بالِ جبریل کی اشاعت سے زمانے کو بھی اقبال کا ہم آہنگ ہونا پڑا ۔ یہ صحیح ہے کہ ترجمانِ حقیقت نے اپنی قدیم ڈگر سے ہٹ کر کوئی نئی شاہراہ اختیار نہیں کی ۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے ایک طویل وقفہ کے بعد اردو کا کلام دنیا کے سامنے پیش کیا ہے ۔ تو اس لحاظ سے کسی کو مایوس ہونے کا موقع نہیں دیا ۔ کہ اس کا راہوار فکر زمانہ کی تیز رفتاری کا ہم رکاب رہا ہے ۔ فرسودگی سے اقبال کو ابتدا سے نفرت تھی ۔ لیکن دور حاضر کی معاشرت ، مذہب ، تمدن اور تعلیم کے مستقبل کے متعلق جن فیصلوں کا اعلان کرنے سے وہ چند برس پہلے ہچکچاتا تھا ، آج وہ اپنی عمر کی پختگی کے بل بوتے پر یہی فیصلے کھلے الفاظ میں سناتا ہے ۔ شباب کے انحطاط کے ساتھ فطری طور پر اس کی ذہنی روا داری محصور حدود ہو گئی ہے ۔ وہ غلط کو مشکوک یا صحیح کو مناسب نہیں کہتا ۔ بلکہ غلط کو غلط کہہ کر اسے

زندگی کے لیے سم قاتل قرار دیتا ہے اور صحیح کو صحیح کہہ کر اسے زندگی کا فرض سمجھنے پر اصرار کرتا ہے۔ مجمل طور پر بالِ جبریل اقبال کی ابتدائی تصانیف کی صدائے بازگشت ہے۔ لیکن زیادہ بلند اور واضح۔

خدا سے شوخیاں

خدا سے شوخیاں کرنا اقبال کا پرانا وطیرہ ہے۔ ''شکوہ'' شوخی کی ایک نہایت کامیاب مثال ہے۔ لیکن فارسی اور اردو کے ابتدائی کلام میں طعن کا مزاج نہایت لطیف تھا۔ ابنِ آدم کے اخلاقی انحطاط سے نالاں ہوکر اقبال خدا سے شکایت کرتا ہے۔ لیکن التجایانہ انداز میں:

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک
یا دگر ابلیس بہر امتحان عقل و دیں
یا چناں کن یا چنیں
یا جہانے تازۂ یا امتحانے تازۂ
می کنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں
یا چناں کن یا چنیں

مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کا جذب بے باق شوق گستاخ کی صورت اختیار کر لیتا ہے:

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اور وہ دنیا کی علم روش کے مطابق لیکن احسن طریق سے خالق بحر و بر کو بخیلی سے مطعون کرتا ہے:

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے؟
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے ؟

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

خدائے مہر و ماہ کی نا انصافیوں کی شکایت یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی قوت عطا و غضب پر بھی تشکیک کا اظہار کیا جاتا ہے :

اک مفلس خود دار یہ کہتا تھا خدا سے
میں کر نہیں سکتا گلۂ درد فقیری

لیکن یہ بتا تیری اجازت سے فرشتے
کرتے ہیں عطا مرد فرو مایہ کو میری ؟

دنیاوی نظام کے اختلال کا ذمہ دار بھی خدا ہی ٹھہرایا جاتا ہے ، اور اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیا جاتا ہے :

اگر کج رو ہیں انجم ، آسماں تیرا ہے یا میرا ؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو ، جہاں تیرا ہے یا میرا ؟

ابن آدم کے صعود و ہبوط کو اقبال خدا کا صعود و ہبوط سمجھتا ہے ۔ کیونکہ اس کے نزدیک آدم خاکی کی تابانی سے ہی خدا کا جہان روشن ہے اور اس کے زوال سے اس تابانی کا فقدان لازمی ہے :

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا ؟

باغِ بہشت سے خروج پر خود پشیمان ہونے کی بجائے شاعر اپنی اہمیت بلند کرتے ہوئے خدا کو طعنہ دیتا ہے :

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں ؟
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

سبحان اللہ انسانی تعلی کی انتہا ہے کہ اپنی مصروفیت کے عذر پر خدا کو بھی منتظر رہنے کے لیے کہا جاتا ہے ۔

انسان کی فسق و فجور کی زندگی کے مطالعہ سے شاعر کو ندامت محسوس ہوتی ہے ۔ لیکن اپنی شوخی کی آڑ لے کر ''مختار کل'' کو ہی اس زندگی کا ذمہ دار قرار دے دیتا ہے :

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر !

معین اوقات میں تو شاعر بندگی کو متاع بے بہا سمجھتا ہے :

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

لیکن یہی بندگی خدائی کے ''دردِ سر'' سے کسی وقت زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے :

خدائی اہتمام خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے

و لیکن بندگی استغفراللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

دنیا و عقبیٰ کی فنا و بقا کے خیال سے شاعر کا آزاد ذہن گھبرانے لگتا ہے ۔ کیونکہ وہ ہر ایک طرح کی پابندی سے متنفر ہے :

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی ، وہاں جینے کی پابندی

انسان اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر نازاں ہے ۔ خدا اس کی تخلیق کو کار نادر سمجھتا ہے اور اپنے تخلیق کردہ شاہکار کے سامنے کتاب فطرت کے ورق یکے بعد دیگرے الٹ کر اسے بحر و بر پر حکمران کر رہا ہے ۔ لیکن اقبال خالق ارض و سما کے اس شہ کار کی کورذوقی اور بے بصری سے نالاں ہے :

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا

نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا ؟

ابن آدم کی عظمت

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

عظمت آدم میں اقبال روز اول سے رطب اللسان ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا ، کہ یہی جذبہ اس کی ان نظموں میں کار فرما ہے جو اس نے تحفظ خودی کی تلقین کے لیے لکھی ہیں ۔ اس کا ایمان ہے کہ انسان کو فطرت سے بے پناہ طاقتیں ودیعت کی گئی ہیں ۔ اور اگر وہ ان طاقتوں سے کام لینے کی صلاحیت پیدا کر لے تو مخلوقات میں اس کا رتبہ سب سے بلند اور ارفع تسلیم کیا جائے ۔ اور اس کی کرشمہ سازیاں کائنات کی تخیر افروز تخیلات کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیں ۔ ابن آدم کے عروج کے امکانات اقبال کے نزدیک غیر معین حد

تک زیادہ ہیں :

غروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اقبال خاک زندہ کا مقام معین کرنے کے لیے انجم شناس کے علم کو کافی نہیں سمجھتا ۔ استقلال اور شجاعت کی گود میں پلے ہوئے انسانی عزائم کی شکست و ریخت کے لیے اس کے نزدیک نجوم سماوی کے اثرات ہیچ ہیں :

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کر رہے ہیں ۔ جنت سے خروج خود ایک ایسا سانحہ تھا جس سے آدم کی عظمت داغ دار ہو رہی تھی ۔ لیکن فرشتے یہ سمجھنے پر بھی کہ آدم کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے اس کی عظمت کے گیت گا رہے ہیں :

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

شاعر کا یہ تخیل صرف اس ذہن کی تخلیق ہے جو ابن آدم کے احترام سے لبریز ہے ۔

یہی نہیں کہ کار کنان سماوی سے آدم پر شوکت طریق پر رخصت ہوتا ہے ۔ بلکہ روح ارضی بھی اس کے عظمت کے احساس کا اظہار کرتے ہوئے اس کا استقبال کرتی ہے ، اور

اسے اس کی امکانی طاقتوں کے تصور کی یاد دلا کر اس کی ہمت افزائی کرتی ہے :

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ
خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے شہر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

ترجمان حقیقت ''خاک پر اسرار'' کی عظمت کا قائل ہے۔ لیکن ہر لحظہ وہ اسے کوشش پیہم کی تلقین کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر صحیح عظمت کی تحصیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ عظمت حاصل ہو جائے تو انسان کائنات پر مستولی ہو جائے :

واقف ہو اگر لذت بیداری شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پر اسرار
آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار

بلند منتہائے مدعا کی تعلیم اور دعوت عمل

اقبال جب اپنے منتہائے مدعا اور ہدف کو معین کرتا ہے تو اس کا درجہ نہایت بلند مقرر کرتا ہے۔ آسان اور سہل الحصول کامیابی سے نہ اسے کوئی مسرت حاصل ہوتی ہے اور نہ ایسی تحصیل اس کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتی ہے۔ قناعت اس کے نزدیک موت کے مترادف ہے، اس لیے اس کی روح ہر وقت کسی نئے منتہائے مدعا کی جستجو میں مضطرب رہتی ہے۔ وہ زندگی کو سر تا سر شباب کے حوصلہ افزا جذبات سے مملو دیکھنے کا آرزو مند رہتا ہے اور سہولت سے اسے نفرت ہے۔ غالباً یہی وہ تعلیم ہے جو کسی مردہ قوم کو دوبارہ زندگی بخش سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس قوم کے معطل اعضا اس تعلیم کو قبول کرنا گوارا کریں۔ ملاحظہ ہو کہ اقبال کس طرح قناعت سے نفرت کی تعلیم دیتا ہے، اور اپنا مقصود کتنا بلند معین کرنے کی تلقین کرتا ہے:

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
- - - - - - - - - - - - - - - - -
- - - - - - - - - - - - - - - - -
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسمان اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ذیل کا شعر بھی اسی تعلیم کا حامل ہے:

فضا تری مہ و پروین سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

غور کا مقام ہے کہ جو اسیرِ مکاں اپنے خاکداں کی بلندیوں تک بھی نہیں پہنچ سکا ، شاعر اسے لامکاں کی حدود تک پہنچنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہی تعلیم ایک دوسرے اسلوب سے پیش کی گئی ہے :

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بے کراں کے لیے

ترجمانِ حقیقت کے نزدیک فطرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ وہ صرف سعی پیہم اور عزم بلند کے صلہ میں ہی سرافرازی عطا کرتی ہے اور جو انسان ان خوبیوں سے عاری ہے وہ کسی طرح بھی سر بلندی کا مستحق نہیں :

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر
یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

اپنی مساعی پر عدم اعتمادی اور دوسروں کی دریوزہ گری ایک ایسا عیب ہے جسے کوئی خوبی بھی رفع نہیں کر سکتی ۔ خواہ اپنےطور پر یہ خوبی کتنی ہی عظیم الشان ہو ۔ پروانہ اپنی بلند حوصلگی کی شیخی بگھارتا ہوا جگنو پر طعنہ زن ہے :

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

لیکن شاعر کے نزدیک جگنو کا پایہ اس لحاظ سے نہایت بلند ہے ، کہ وہ دریوزہ گر غیر نہیں :

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

عزم بلند کی توضیح چیونٹی اور عقاب کے مکالمہ میں نہایت دلچسپ اور نادر اسلوب میں کی گئی ہے - ملاحظہ ہو :

چیونٹی

میں پامال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں
میں نہ سپر کو نہیں لاتا نگاہ میں

اقبال بلند منتہائے مدعا کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو تلقین عمل بھی کرتا ہے - اس کے نزدیک زندگی عبارت ہے مسلسل کوشش اور عمل سے - یہ عمل اور کوشش اپنی نوعیت کے لحاظ سے ستیزہ کاری کی شکل ہی کیوں نہ اختیار کر لے - لیکن شاعر کے خیال میں پھر بھی عمل کی زندگی راہبی جیسی پر سکون اور پر امن زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے - یہاں تک کہ اس کا خدا بھی افسردگی سے متنفر ہے :

ترا تن روح سے نا آشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نا رسا ہے
تن بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

پیر و مرید کے مکالمہ میں غایت دین نبی ؐ کی توضیح اور دنیاوی اقتدار کی تحصیل کا طریقہ ملاحظہ ہو :

مرید ہندی

کار و بار خسروی یا راہبی ؟
کیا ہے آخر غایت دین نبی ؐ

پیر رومی

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

مرید ہندی

کس طرح قابو میں آئے آب و گل
کس طرح بیدار ہو سینے میں دل؟

پیر رومی

بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند
چوں جنازہ نے کہ بر گردن برند

دین نبیؐ میں جنگ و شکوہ صرف مصلحت ہی نہیں، بلکہ اس مصلحت کو ''تسبیح و مناجات'' کا رنگ دینے والے حضرات کو اقبال جسدِ بے جان سمجھتا ہے۔

قطعہ ملاحظہ ہو:

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ خدا مست
یہ مذہب ملاّ و جمادات و نباتات

عملی زندگی کی توصیف میں چند اور پر جوش شعر سن لیجیے:

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہاں تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوشِ کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

جوشِ کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

تہذیب جدید پر تبصرہ

آج سے کئی سال قبل اقبال نے مزاحاً کہا تھا :

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

یہ شعر وقتی جذبہ کے ماتحت کہا گیا تھا ۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہی جذبہ پختہ ہو کر مستقل عقیدہ کی صورت اختیار کر گیا ۔ اور اقبال تہذیب جدید کو ہندوستانی مسلمان کے لیے سم قاتل سمجھنے لگا ۔ چنانچہ جب بالِ جبریل مرتب ہوتی ہے ۔ تو شاعر مشرق فرنگی مدنیت پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے :

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائیٔ تعمیر میں ، رونق میں ، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
بیتے ہیں لہو ، دیتے ہیں تعلیم مساوات !
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات ؟

فرنگی مدنیت کا دلچسپ تجزیہ آپ نے سن لیا ۔ تہذیب جدید کی روشنی علم و ہنر ، سرمایہ داری کی مدد سے شخصی وجاہت کی ترویج اور حکومت کی تعلیم مساوات کا حاصل بے کاری ، عریانی ، میخواری اور افلاس کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ یہ حقائق کی کتنی اثر انگیز تفصیل ہے اور ایسی تفصیل جو اقبال کے سوا شاید کوئی اور شاعر پیش ہی نہ کر سکتا ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اقبال تہذیب نوی کے مسموم اثرات سے حد درجہ خائف ہے ۔ اس کے نزدیک جدید تہذیب کی حقیقت شعبدہ بازی کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ اس کا راسخ عقیدہ ہے ، کہ نئی تہذیب ہماری قوم و ملت کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ۔ کیونکہ اس تہذیب سے ہماری اپنی تہذیب اس قدر ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کو مسخ کرنے یا اس کی جگہ نئی تہذیب کو اختیار کرنا ہمارے لیے سودمند نہیں ہو سکتا ۔ یہ اس لیے کہ نئی تہذیب اپنی ظاہری دل کشی کے سوا اور کسی طرح کی خوبی کی حامل نہیں :

نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

اسی خیال کو استعارۃً نظم کیا ہے :

تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ شاعر مشرق صرف تہذیب جدید سے نفرت کا اظہار ہی نہیں کرتا۔ بلکہ ساتھ ساتھ ہی وہ قوم و ملت کو ڈرا کر اس کے سامنے اس زبوں حالی کا نقشہ بھی پیش کر رہا ہے جس پر ملت کا انجام اس تہذیب کی بدولت ہونے والا ہے :

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا
دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا
اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

شاعر زمانۂ حاضر کی کائنات کا جائزہ لیتا ہے :

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا ؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

اور پھر خائف ہو کر اپنے بیٹے (جاوید) سے کہتا ہے :

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

''پیر و مرید'' کے مکالمہ میں بھی اسی خدشہ کا اظہار کیا گیا ہے :

مرید ہندی

ہے نگہ خاوراں مسحورِ غرب
حورِ جنت سے ہے خوش تر حورِ غرب

پیر رومی

ظاہر نقرہ گر اسپید است و نو
دست و جامہ ہم سیہ گردد ازو

مرید ہندی

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں
ساحر افرنگ کا صید زبوں

پیر رومی

مرغِ پر نا رستہ چوں پراں شود
طعمۂ ہر گربۂ دراں شود

علم حاضر، عصر حاضر اور اس کے مکتب کے لیے اقبال ہمہ تن شکایت ہے ۔ ملاحظہ ہو :

مرید ہندی

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیر رومی

علم را بر تن زنی مارے بود !
علم را بر دل زنی یارے بود !

دور حاضر مستِ چنگ و بے سرور !
بے ثبات و بے یقین و بے حضور !

یہ بتان عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ ! نہ تراش آذرانہ

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

سنیما کی تحلیل ملاحظہ ہو :

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے
سنیما ہے یا صنعت آذری ہے

وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا
یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے

وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا
یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے

وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی
وہ بت‌خانہ خاکی یہ خاکستری ہے

قائدین پر تنقید

ملی ضروریات کے لحاظ سے غالباً یہ سب سے زیادہ اہم موضوع ہے ، جس پر اقبال نے قلم اٹھایا ہے ۔ ہندوستان کی بالعموم اور مسلمانوں کی بالخصوص بد بختی کا راز اسی ایک حقیقت میں پنہاں ہے کہ انہیں صحیح قسم کے بہت کم قائدین میسر آئے ہیں ۔ میں تفصیل سے اجتناب کرنا چاہتا ہوں ۔ لیکن کوئی آدمی اگر مختلف سیاسی ، قومی ، مذہبی ، سماجی

اور معاشرتی تحریکات کا جائزہ لے اور بنظر امعان ان کا تجزیہ کرے تو اسے معلوم ہوگا ، کہ ان تحریکات پر قوم و ملت کی بے شمار قوتیں صرف ہو چکی ہیں ۔ لیکن تا ہنوز کسی ایک تحریک سے شاذ ہی کامیاب نتائج برآمد ہوئے ہوں ۔ سیاسیین نے مختلف تحریکات جاری کیں اور ملک نے حتی المقدور روپے ، وقت اور جان کی قربانیوں سے ان تحریکات کو کامیاب بنانے کی کوشش کی ۔ مذہبی پیشواؤں نے تبلیغ اور کئی دیگر تحریکات سے اپنی ملت کی جان بازی کا امتحان لیا ۔ سماجی ریفارمروں نے کئی طرح کی اصلاحات کا ڈھونگ رچا کر پانی کی طرح قوم کا روپیہ بہایا ۔ لیکن ان سب تحریکات کا حاصل کچھ بھی نہ نکلا یا نکلا تو اس قدر بے مایہ کہ شاید اس سے کئی گنا زیادہ ارتقا ملک میں زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ از خود ہو جاتا ۔ سوال پیدا ہوتا ہے ، کہ اس کی وجہ کیا تھی ؟ اس کا واحد جواب یہی ہے کہ ملک کو صحیح قسم کے قائدین میسر نہ آ سکے ۔ بیشتر قائدین نے صرف ذاتی منفعت کے لیے کچھ کام کیے یا کر رہے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی مساعی سے نہ کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوا ، اور نہ برآمد ہونے کا امکان ہے ۔ بلکہ مخصوص قسم کے قائدین قوم و ملت کے مزید انحطاط کا باعث ہو رہے ہیں ۔ اقبال نے مشاق نباض کی طرح ملت کے اس روگ کو بھانپا اور پھر اپنی بے باکی سے مجبور ہو کر ملت کے اس قبیح عضو کو بے نقاب کیا ، جو اس کے خیال میں ایک مذموم مرض کی طرح ملت کے باقی اعضا کو ناکارہ کر رہا تھا ۔ شیخ حرم اور قائدین کی شرمناک زندگی سے متاثر ہو کر اقبال جل اٹھا ۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ ؟

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز ! گفتار واہی

پیر حرم کی بے عمل زندگی کا کتنا اچھا مرقع ہے۔ صوفی و ملا کی ایک اور تصویر ملاحظہ ہو :

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوز مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

کرے گی داور محشر کو شرمسار اک روز
کتابِ صوفی و ملا کی سادہ اوراق

ہمارے فلسفی اور ملا کی بے مصرف زندگی پر ایک طعن ہے :

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت ! وہ اندیشہ و نظر کا فساد

قرآن مجید کی الٹی پلٹی تاویلیں کرنے والوں کے متعلق کہا ہے :

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند

ملا پر ایک طنز ہے :

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

اپنے عہد حاضر کے قائدین کے مضر اثرات کا رونا روتے ہوئے کہا :

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
دلِ طور سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم
مسلمان ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن تصوف شریعت کلام
بتان عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذت شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا !
یہ سالک مقامات میں کھو گیا !

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے!
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

خطیب کی بے ہودہ مساعی سے متاثر ہو کر انتہائے یاس کا اظہار کیا ہے:

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہو گا
مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب!

مذہبی پیشواؤں کی زندگی پر ایک دلچسپ محاکمہ ملاحظہ ہو:

ملا اور بہشت

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لب کشت
نہیں فردوس مقام جدل و قال و اقول!
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزی اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

اقبال نے انحطاط ملت کی ایک وجہ پیر پرستی بھی بتائی اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ قائدین کی اس جماعت نے ملت اسلامیہ کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ ان خیالات کو ایک باغی مرید کے منہ سے کہلوایا گیا ہے۔

باغی مرید

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن
حقائق کی کتنی عبرت انگیز داستان ہے!

(مجلۂ تاج، لاہور، اپریل ۱۹۳۷ء)

اقبال اور مسلمان مفکر

سنائی

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

آج سے آٹھ سو سال قبل کا تصور کیجیے، جب کہ غزنویوں کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ سلطان غازی سلطان محمود کی سلطنت کی بنیادیں ایک مستحکم قلعہ کی شکل اختیار کر گئی تھیں، اور غزنی کے تخت پر سلطان محمود کی چوتھی پشت میں سے ایک سلطان بہرام شاہ نامی متمکن تھا۔ یہ نہایت شان و شوکت کا بادشاہ اور نہایت علم دوست اور مربی فن تھا۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس کے عہد میں تصوف اور فارسی کی اخلاقی شاعری کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اور چھٹی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے پہلے یہ عمارت گویا انجام کو پہنچ گئی۔

بہرام شاہ سنہ ۵۱۲ ہجری، ۱۱۱۸ عیسوی سے ۵۴۷ ہجری، ۱۱۵۲ عیسوی تک غزنی کا تاج دار رہا اور اس عرصے میں دیگر مہمات کے علاوہ اسے ہندوستان بھی آنا پڑا۔ سلطان نے ایک مرتبہ جب ہندوستان پر حملہ کرنے کی ٹھانی تو اس کے درباری شاعر سنائی نے اس تقریب سے اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ مقصد یہ تھا کہ سلطان کے

مہم پر جانے سے پہلے یہ قصیدہ اس کی خدمت میں پیش کر کے انعام و اکرام حاصل کیا جائے ۔ اس قصیدے سے پہلے اور بھی کئی قصیدے لکھے جا چکے تھے ، اور شاعر کا دامن بادشاہ کی حوصلہ افزائی سے پر کیا جا چکا تھا ۔ سنائی نے گھر پر قصیدہ لکھا اور دربار کے قصد سے گھر سے نکلا ۔ راہ میں ایک حمام تھا ، یہاں ایک پاگل رہا کرتا تھا ۔ اس کا معمول تھا کہ شراب خانوں سے شراب کی تلچھٹ مانگ لایا کرتا اور پی کر مست پڑا رہتا ۔ اسی لیے اس کو لای خوار کہتے تھے۔ سنائی حمام کے برابر سے نکلا تو گنگنانے کی آواز سنی ، ٹھہر گیا ۔ سنا تو لای خوار ساقی سے کہہ رہا تھا ۔ ''ابراہیم شاہ کے اندھے پن کے صدقے میں ایک پیالہ دے دو'' ۔

ساقی نے کہا ''کیا لغو بکتے ہو ، ابراہیم شاہ جیسا بادشاہ تو روئے زمین پر پیدا نہیں ہوا ، وہ نہایت عادل بادشاہ ہے'' ۔

پاگل بولا ''ابھی غزنی کے انتظام سے فارغ نہیں ہوا اور دوسرے ملک پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے ، اس سے بڑھ کر اندھا پن کیا ہوگا!'' ۔

یہ کہہ کر پیالہ اٹھایا اور پی گیا ، پھر ساقی سے کہا :

''اب سنائی کے اندھے پن کے صدقے میں ایک پیالہ اور دے دو'' ۔

ساقی نے کہا ۔ ''سنائی نہایت خوش فکر شاعر ہے ، اس کی برائی کیوں کرتے ہو؟''

پاگل نے کہا ۔ ''اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی کہ دو چار جھوٹ سچ باتیں جوڑ کر کسی بیوقوف رئیس کے پاس

جاتا ہے ، ادب سے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے اور اس کو سناتا ہے۔ قیامت میں اگر سوال ہوا کہ اس دربار میں کیا لایا ہے تو کیا جواب دے گا ؟''

راوی کا بیان ہے کہ سنائی پر اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ اسی وقت سب کچھ چھوڑ چھاڑ گوشہ نشین ہو گیا اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بھٹی کرتا تھا یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو اس کے عقدِ نکاح میں دینا چاہا ، تو اس نے انکار کر دیا۔ چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا :

من نہ مردِ زن و زر و جاہم
بخدا گر کنم و گر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم
بر سرِ تو کہ تاج نہ ستانم

یہ تھے حکیم ابو المجد مجدود سنائی جو غزنی کے رہنے والے تھے اور جن کی خدمت میں فارسی کے سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا روم نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پئے سنائی و عطار آمدیم

اور جن کی ادبی تخلیقات کو حضرت علامہ اقبال نے اس سمندر سے تشبیہ دی ہے ، جس میں لاکھوں موتی ہیں :

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

سنائی کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ سر و پا برہنہ حج

کو گئے وہاں سے واپس آ کر غزنی میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ ننگے پاؤں غزنی کے گلی کوچہ میں پھرا کرتے تھے۔ اُن کے عزیزوں کو رحم آتا، ان کو اس حالت میں دیکھتے تو بے اختیار رو دیتے۔ یہ اُن کو سمجھاتے کہ میری حالت پر رونا نہیں بلکہ خوش ہونا چاہیے۔ ایک دن لوگوں نے پاپوش لا کر پیش کی۔ ان کی خاطر سے پہن لی، لیکن اتنا تعلق بھی ان کی حالت میں خلل انداز ہوا۔ چنانچہ دوسرے دن جوتی اُتار کر پھینک دی اور کہا:

''جو بات مجھ میں کل تھی آج نہیں''۔

حکیم سنائی کی تاریخ پیدائش صحیح طور پر معین نہیں ہوسکی، اور ان کی تاریخ وفات میں بھی اختلاف ہے۔ بہر صورت ۵۲۵ ہجری اور ۵۷۶ ہجری کے درمیان ان کا انتقال ہوا اور غزنی میں دفن ہوئے۔ جہاں اُن کا مزار آج تک مرجع خاص و عام ہے۔ حضرت علامہ اقبال نادر شاہ کی دعوت پر نومبر سنہ ۱۹۳۳ء میں افغانستان گئے تو بڑے شوق سے حکیم سنائی غزنوی کا مزار دیکھنے گئے۔ سید سلیمان ندوی اس سفر میں علامہ مرحوم کے ہمراہ تھے، انھوں نے اپنی تصنیف ''سیرِ افغانستان'' میں اس سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حکیم سنائی کی جلالتِ شان سے کون واقف نہیں۔ ہم سب اس منظر سے متاثر تھے، مگر ہم میں سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا۔ وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہوکر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے''۔

علامہ مرحوم نے اپنے بقول ''اس روز سعید کی یادگار

میں" چند شعر نظم کیے ہیں، جو اب بالِ جبریل کا ایک حصہ ہیں اور جن میں حکیم سنائی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے۔ ان اشعار کا آغاز یوں ہوتا ہے:

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

حکیم سنائی کی تصنیفات میں ایک کلیات ہے جس میں تیس(۳۰) ہزار شعر ہیں۔ سات مثنویاں ہیں۔ حدیقہ، سیر العباد، کارنامۂ بلخ، طریق التحقیق، عشق نامہ، بہروز اور بہرام۔ حدیقہ چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔ باقی مثنویاں ناپید ہیں۔ کلیات میں قصائد، قطعات، غزلیں، رباعیاں سب کچھ ہیں۔

حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جنھوں نے تصوف کو فارسی شاعری سے روشناس کیا۔ اس سے پہلے ابو سعید ابوالخیر کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان میں تصوف کے مسائل، اسرار اور معارف کو اس پرزور انداز میں بیان نہیں کیا گیا جیسے سنائی کی تصنیفات تصوف میں۔ حکیم صاحب خود بھی اس کا دعویٰ کرتے ہیں:

کس نہ گفت ایں چنیں سخن بجہان
ور کسی گفت، گو بیار و بخوان

زیں غلط ہر چہ در جہان سخن است
گر یکی در ہزار آنِ من است

چون ز قرآن گذشتی وز اخبار
نیست کس را ازیں نمط گفتار

حضرتِ علامہ' مرحوم حکیم غزنوی کی شاعری کے اسی صوفیانہ رخ سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ غزنی میں مزارِ حکیم سنائی کی زیارت کے موقع پر حضرت علامہ نے لکھا :

خفتہ در خاکش حکیم غزنوی
از نوائے او دلِ مردان قوی

آں حکیمِ غیب آں صاحب مقام
'ترک جوش' رومی از ذکرش تمام

من ز 'پیدا' او ز 'پنہاں' در سرور
ہر دو را سرمایہ از ذوق حضور

او نقاب از چہرۂ ایماں کشود
فکرِ من تقدیرِ مومن وا نمود

ہر دو را از حکمتِ قرآں سبق
او ز حق گوید من از مردانِ حق

حضرت علامہ نے ان اشعار میں نہ صرف حکیم سنائی کی حکمت کے متعلق اپنے تاثر کو بیان کیا ہے ۔ بلکہ مجمل لیکن نہایت واضح انداز میں حکیم موصوف کی حکمت پر بھی تبصرہ کیا ہے کہ وہ باطن کی اصلاح اور پاکیزگی باطن کے مدعی تھے ۔ حکیم غزنوی کے اپنے کلام کی طرف رجوع کریں تو ہمیں اس دعویٰ کی تائید میں بے شمار مثالیں ملتی ہیں ۔ اور ان تمام مثالوں میں حکیم سنائی نے تمثیل اور منطق دونوں سے کام لے کر اپنے مقصد کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مثلاً یہ بات عام ہے کہ طبیب جس چیز کو منع کرتا ہے لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں ، لیکن اخلاق حدود کی پابندی نہیں کرتے ۔

حالانکہ ان کے لیے خدا حکم دیتا ہے۔ حکیم موصوف اس انسانی کمزوری کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں :

ترا یزداں ہمی گوید کہ در دنیا مخور بادہ
ترا ترسا ہمی گوید کہ در خضرا مخور حلوا

ز بہر دین تو نگذاری حرام از حرمت یزدان
و لیک از بہر تن مانی حلال از گفتہ ی ترسا

دنیاوی تعلقات کے متعلق سنائی کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ کہ جب مرو تو تم جھگڑوں سے چھوٹ جاؤ ، نہ یہ کہ تم مرو تو لوگ جھگڑے سے چھوٹیں :

آن چنان زی کہ چو میری برہی
نہ چنان زی کہ چو میری برہند

دنیا اور طالبانِ دنیا کے متعلق سنائی نے اپنا نقطۂ نظر یوں پیش کیا ہے :

این جہان بر مثالِ مرداریست
کرگسان گرد او ہزار ہزار

این مر آن را ہمی کشد مخلب
آن مر آن را ہمی زند منقار

آخرالامر بر پرند ہمہ
وز ہمہ باز ماند این مردار

حصول مقصد کے لیے دیر اور انتظار شرط ہے اور جو مقصد جس قدر اہم ہوگا اس کے حصول میں اکثر اسی قدر زیادہ

دیر ہوگی ۔ سنائی نے اسی خیال کو تمثیلات سے واضح کیا ہے :

ہر خسی از رنگ و رفتاری بدین رہ کی رسد
درد باید صبر سوز و مرد باید گام زن
ہفتہ ها باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل
شاہدی را حلہ گردد یا شہیدی را کفن
ماہ ها باید کہ یک مشت پشم از پشتِ میش
صوفی ای را خرقہ گردد یا حصاری را رسن
سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشان یا عقیق اندر یمن
ساعتِ بسیار می باید کشیدن انتظار
تا کہ در جوفِ صدف باران شود درِ عدن
قرن ها باید کہ تا یک کودکی از لطف طبع
عالمی گویا شود یا فاضلی صاحب سخن
صدق و اخلاص و درستی باید و عمر دراز
تا قرینِ حق شود صاحب قرانی در قرن

حکیم غزنوی کی پیروی میں علامہ اقبال نے جو نظم لکھی ہے اس میں کئی اشعار میں اس طرز فکر کو نئے اسلوب میں پیش کیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتی بستم سرِ خود را

رہے ہیں اور بھی فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

حکیم الامت نے پھر فارسی میں انھی خیالات کو سنائی کی زبان سے ''مسافر'' میں کہلوایا ہے :

فکرِ جان کن چون زنان برتن متن
ہمچو مردان گوئی در میدان فگن

سلطنت اندر جہانِ آب و گل
قیمت او قطرۂ از خونِ دل

باش تا بینی بہارِ دیگری
از بہارِ پاستان رنگین تری

بر زمان تدبیر ہا دارد رقیب
تا نگیری از بہار خود نصیب

بر درونِ شاخ گل دارم نظر
غنچہ ہا را دیدہ ام اندر سفر

لالہ را در وادی و کوہ و دمن
از دمیدن باز نتوان داشتن

(مجلۂ آہنگ ، کراچی ، یکم فروری ۱۹۵۲ء)

تقدیرِ امم

قوموں کے عروج و زوال کی داستان بالعموم مورخوں کے زیر بحث رہی ہے۔ رزمیہ شاعروں نے بھی اس میدان میں جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں اور اخلاقیین نے بھی دنیا کی نامور شخصیتوں کو سراہنے یا مطعون کرنے کے لیے عروج و زوال کے اسباب و وسائل کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ لیکن ان تمام باکمال فن‌کاروں کا مشترک نظریہ یہ رہا ہے کہ مادی حالات کے بہتر یا بدتر ہونے کی وجہ سے کسی قوم نے بالترتیب عروج یا زوال حاصل کیا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا ہے کہ افق تاریخ پر ایسی شخصیتیں نمودار ہوئیں جن کے عروج کی داستان نے اقوام عالم کو محدود عرصے کے لیے محو حیرت بنا دیا۔ لیکن بہت ہی جلد زوال نے ان کا تعاقب کیا تو دنیا کا ایک کثیر گویا طبقہ ان پر لعن طعن کرنے لگا۔ ماضی قریب میں نپولین، ہٹلر اور مسولینی کا نام اس فہرست سے پیش کیا جاتا ہے۔ جن کے ساتھ یہ سلوک ہوا ان لوگوں کے مدحیہ قصیدے اس وقت تک تو پڑھے جاتے رہے جب تک وہ برسرِ اقتدار تھے اور ملک پر ملک فتح کر رہے تھے۔ لیکن جب انھیں ناکامی یا موت نے آ لیا تو یہی لوگ مردود گردانے گئے اور انھیں ہدف ملامت بنایا گیا۔ کیونکہ ناقدین نے معیار یہی رکھا ہوا تھا کہ مادی حالات کس حد تک کون سی شخصیت کا ساتھ دے رہے ہیں۔

مسلمانوں کی اپنی تاریخ بھی آج تک کچھ اس انداز میں لکھی جاتی رہی ہے - کیونکہ عروج و زوال کو جانچنے اور پرکھنے کا معیار مادی کامیابی ہی سمجھا جاتا رہا ہے - لیکن دنیائے اسلام میں اقبال پہلا مفکر ہے جس نے مورخوں ، شاعروں اور اخلاقیین کے مسلمہ اصول اور نظریات کے خلاف امتوں کے عروج و زوال کو بالعموم اور ملت اسلامیہ کی تقدیر کی ساخت و ریخت کو بالخصوص خدا اندیشی اور حق پرستی سے متعلق کیا ہے - اس کے نزدیک مادی وسائل اوز دنیاوی جاہ و حشمت کی بھی کچھ اہمیت ہے اور مادی وسائل میں وہ علم و فن کو ایک خاص درجہ دیتا ہے :

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نی ز رقص دخترانِ بی حجاب
نی ز سحر ساحرانِ لالہ دوست
نی ز عریاں ساق و نی از قطع موست
محکمی اُو را نہ از لا دینی است
نی فروغش از خطِ لا طینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

(جاوید نامہ)

فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہنرمند
شام اس کی ہے مانند سحر ، صاحب پرتو
وہ صاحب فن چاہے تو فن کی برکت سے
ٹپکے بدن مہر سے شبنم کی طرح ضو

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

(ضرب کلیم ۱۶۹ ، ۱۷۰)

لیکن ''علم و فن'' یا دیگر مادی وسائل کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اقبال نے قومی عروج اور ملی استحکام کے سلسلے میں اس علم کو کوئی اہمیت نہیں دی جو انسان کو خدا اندیشی اور حق پرستی سے دور لے جائے :

زندگی کچھ اور شے ہے ، علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوز جگر ہے ، علم ہے کچھ اور شے

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

(ضرب کلیم ۷۸)

وہ علم نہیں ، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کف جو

(ضرب کلیم ۱۶۹)

وہ صاف لفظوں میں انسان کے لیے ایک لائحۂ عمل بیان کرتا ہے :

در قبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و خدا اندیش زی
قربِ حق از ہر عمل مقصود دار
تا ز تو گردد جلالش آشکار

(اسرار خودی ۷۰)

اور اس لائحہ عمل کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے آئین یوں تجویز کرتا ہے :

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست ؟
زیر گردوں سر تمکین تو چیست ؟

آن کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

نسخہ اسرار تکوین حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

نوع انسان را پیام آخریں
حامل او رحمۃ للعالمیں

اوج می گیرد ازو نا ارجمند
بندہ را از سجدہ سازد سربلند

(اسرار و رموز ۱۴۰ ، ۱۴۱)

ارجمندی حاصل کرنے کا لائحہ عمل بیان کرنے اور اس لائحہ عمل کی پیروی کرنے کا آئین تجویز کرنے کے بعد اقبال نے نہایت واشگاف انداز میں متعدد مقامات پر یہ بیان کیا ہے کہ مسلمان نے قصر ملت کے استحکام کو اس آئین سے منحرف ہو کر کتنا نقصان پہنچایا ہے ۔ اقبال کے ہاں مسلمان کے زوال کا یہ قصہ ''جواب شکوہ'' سے شروع ہوتا ہے اور اس کی آخری تصنیف ''ارمغان حجاز'' تک جاری رہتا ہے :

کون ہے تارک آئین رسول مختار
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار
ہو گئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں
(بانگ درا ۲۲۵)

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق
مومن و غداری و فقر و نفاق

لا اِلٰہ اندر نمازش بود و نیست
ناز ہا اندر نیازش بود و نیست

سوز در صوم و صلٰوۃ او نماند
جلوہ ہا در کائنات او نماند

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ
فتنۂ او حب مال و ترس مرگ

رفت ازو آن مستی و ذوق و سرور
دین او اندر کتاب و او بگور
(جاوید نامہ ۲۳۴ ، ۲۳۵)

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

تمدن ، تصوف ، شریعت ، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

(بال جبریل ۱۶۰ ، ۱۶۸)

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(ضرب کلیم ۸)

شبی پیش خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

(ارمغان حجاز ۵۴)

اُمت کے روایات میں کھو جانے اور ناخوب کو خوب بنا لینے کے بعد سیاسی فضا میں جعفر و صادق کثرت سے پیدا ہونے لگتے ہیں اور تقدیر امت ایک ایسی کروٹ لیتی ہے جو بظاہر تو نہایت خوش نما نظر آتی ہے لیکن دراصل یہ زوال کا آغاز ہوتا ہے اور قوم کے فرد کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

گاہ او را با کلیسا ساز باز
گاہ پیش دیریاں اندر نیاز

دیں او آئیں او سوداگری است
عنتری اندر لباس حیدری است

تا جہانِ رنگ و بو گردد دگر
رسم او آئین او گردد دگر

ظاہر او از غم دیں درد مند
باطنش چوں دیریاں زنار بند

(جاوید نامہ ۱۷۰)

افراد کی یہ کیفیت دیکھ کر اقبال فتویٰ دیتا ہے :

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است
ایں مسلمانے کہن ملت کش است

خنداں است و باکس یار نیست
مار اگر خنداں شود جز مار نیست!

ملتی را ہر کجا غارت گری است
اصل او از صادق و جعفری است

(جاوید نامہ ۱۷۰)

افراد ملت کی یہ منافقانہ روش تقدیر امت کو اس موڑ پہ لے آتی ہے جہاں قوم کی خوشحالی اور قوم کی حقیقی عظمت اس کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے ۔ قرآن مجید نے فطرت کے اس اصول کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارنا شروع کرتی ہے تو فطرت اس کام میں بھی اس کی مدد کرتی ہے اور تاریخ عالم بھی اس کی شاہد ہے کہ ایک قوم پر دوسری قوم مسلط ہوتی آئی ہے ۔ اقبال نے بھی ملت کی زوال آمادگی کو بھانپ

کر اس خطرے کو یوں بیان کیا ہے :

محفلِ ما بے مے و بے ساق است
سازِ قرآن را نوا ہا باق است
زخمہ ما بے اثر افتد اگر
آسمان دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکر حق از امتان آمد غنی
از زمان و از مکان آمد غنی
ذکر حق از ذکر ہر ذاکر جدا ست
احتیاج روم و شام او را کجا ست
حق اگر از پیش ما بردارد‌ش
پیش قومے دیگرے بگزاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن
ہر زماں جانم بسوزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتش خود بر دل دیگر زنند

(جاوید نامہ ۹۱ ، ۹۲)

حکیم اُمت اس خطرے کو بھانپتے ہوئے اس حقیقت سے بھی غافل نہیں تھے کہ جہاں مسلمان کی تقدیر رو بہ زوال ہے ، وہاں مغرب اپنی مرکزیت کو مضبوط کر رہا ہے اور اندرون ملک ساتھ کا ہمسایہ بھی اپنے استحکام کے لیے دن رات کوشاں ہے :

لرد مغرب آں سراپا مکر و فن
اہل دیں را داد تعلیم وطن

او بفکر مرکز و تو در نفاق
بگزر از شام و فلسطین و عراق

(جاوید نامہ ۶۷)

نگہ دارد برہمن کار خود را
نمی گوید بہ کس اسرار خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگزر
بدوش خود برد زنار خود را

(ارمغان حجاز ۱۳۷)

شاعر ملت قوم کو اس حیص بیص کے عالم میں دیکھ کر یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اس زبوں حالی کے لیے تنہا قوم ہی ذمے دار نہ تھی ۔ خدا اندیشی کی ترویج و اشاعت کا اجارہ جن لوگوں نے لے لیا تھا ۔ اقبال ان سے قطعاً مطمئن نہ تھا ۔ رسمی ملا اور دین کے نام نہاد پیشواؤں کے خلاف اس نے مستقل جہاد اور پھر علی الاعلان کہا :

مسلم ایں کشور از خود نا امید
قرن با شد با خدا مردی ندید

اس کے ساتھ ہی اس نے مسلمان کی توجہ اس امر کی طرف بھی دلائی :

چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرد شستم
تقدیر امم دیدم پنہاں بکتاب اندر

لیکن اس سے کیا ہوتا تھا ۔ کہنے والا اپنی بات کہتا رہا ۔ کچھ لوگ اسے غور سے سنتے رہے اور کچھ اسے محض دیوانے کی بڑ سمجھتے رہے ۔ پاکستان کا اولین تصور اسی کے

تخیل کا کرشمہ تھا اور اس کی وفات کے باوجود اس کی تبلیغ پاکستان کو قائم کر کے رہی۔

پاکستان کا قیام ہندی مسلمانوں کی تقدیر کا ایک ایسا موڑ تھا جس کو ایک مردِ خدا یعنی قائد اعظم محمد علی جناح کی بے لوث مساعی اور پاکستان کے بانی یعنی اقبال کی تبلیغ کے بدولت ہندوستانی مسلمان نہایت آسانی سے عبور کر آئے اور پاکستان کی یافت در حقیقت دولت خدا داد ثابت ہوئی۔ یہ دعویٰ ان لاکھوں مظلومین کی صعوبت کے شدید احساس اور اس قیامت صغریٰ کو سامنے رکھ کر کر رہا ہوں جس میں ہزاروں مسلمان شہید اور لاکھوں بے گھر ہوئے۔ میں ان کے مصائب کو پاکستان کے لیے قربانی کے زمرے میں شمار نہیں کرتا۔ کیونکہ مورخ جب کبھی قیام پاکستان کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو یہی کہے گا کہ پاکستان بننے کے بعد لاکھوں ہندی مسلمانوں کو غیر مسلموں کی وحشیانہ بربریت نے موت کے گھاٹ اتار دیا اور گھر سے بے گھر کر دیا۔ لیکن ان کی موت اور ان کے مصائب کو قیامِ پاکستان کے لیے قربانی میں شامل کرنا تاریخ سے انحراف ہے۔ کیونکہ آپ ملک بدر ہونے والے ہندی مسلمانوں کی مصیبت کو پاکستان کے لیے قربانی سمجھتے رہیں تو پھر جب تک حکومت ہند ہندوستان سے مسلمانوں کو بھگتی رہے گی، قیام پاکستان کے لیے اس قربانی کا سلسلہ جاری رہے گا، یہ ایک ضمنی بات تھی، کہنا صرف یہ مقصود ہے کہ پاکستان کا تخیل اور یہ کوشش دونوں پُر امن طریقے سے دنیا کے سامنے پیش ہوئے اور ان کا نتیجہ بھی عدیم النظیر طریقے پر پُر امن رہا۔ ہم نے پاکستان کو خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر

حاصل کیا ۔ البتہ یہ بات دوسری ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہمیں کس قدر خون ہندی مسلمان کا خاک ہند کی نذر کرنا پڑا ۔

اور جب ہم اس تاریخی حقیقت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور تاریخ پر جذبات کے پھیلے ہوئے پردے ہٹانا چاہتے ہیں تو ہمارے سامنے کئی سوالات آتے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ

۱ ۔ کیا پاکستان کے تخیل کے بانی کے ذہن میں یہی بات تھی جو معرض وجود میں آئی ؟

۲ ۔ کیا پاکستان بننے کے بعد عنتر اندر لباس حیدری کا قلع قمع ہوا یا اس کو مزید فروغ حاصل ہوا ؟

۳ ۔ کیا اس ملت نے جعفر و صادق کے پیروؤں کو ختم کر دیا ، یا ان کو اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کی اجازت دے دی ؟

۴ ۔ کیا آئین رسول مختارؐ کو ترویج ہوئی ، یا اس کی اشاعت کے دروازے بدستور بند رہے ؟

۵ ۔ کیا قبائے خسروی پہننے والوں نے درویشی اختیار کی ، یا وہ بدستور تاخدا اندیش رہے ؟

۶ ۔ حق پرستی کا شعار ملت نے اختیار کیا ، یا

قومی فروختند و چہ ارزاں فروختند

کی داستان ماضی پر عمل ہوتا رہا ۔

بظاہر ان سوالوں کا صحیح جواب دینا بہت مشکل ہوتا ہے ۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ آپ جس ہنگامے کے عین وسط میں کھڑے ہوں ، آپ اس کے امتداد و تاثر کو

کماحقہ جانچ نہیں سکتے ۔ منظر کی وسعت سے ذرا دور ہٹ کر ہی اس کے صواب و ناصواب کو پرکھا جا سکتا ہے ۔ لیکن بعض اہل فکر احباب کا خیال ہے کہ قومی ہنگامے کی اس ہا و ہو کے باوجود کچھ فیصلے دیے جا سکتے ہیں ، اور میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ ہندی ملت اسلامیہ کی تقدیر کا انتہائی نقطۂ عروج وہ دن تھا جس دن پاکستان کا قیام عمل میں آیا ۔ اقبال اس کیفیت کو شمشیر و سنان سے تعبیر کرتا ہے اور اس نقطۂ عروج سے پھر تقدیر اُمت مائل بہ زوال رہی ، یا اقبال کے بقول ''طاؤس و رباب'' کا زمانہ شروع ہوا ۔ کیونکہ ملت اسلامیہ نے رفتہ رفتہ ان تمام معایب کے لیے اپنی آغوش وا کر دی جس کا رونا حکیم اُمت ساری عمر روتا رہا ۔ یہ حکم لگانا مشکل ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا ۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

(بال جبریل ۹۷)

اور ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات حال کے جائزوں کی تردید کر دیں ۔ لیکن وقت آ گیا ہے کہ ہم دیانتداری سے اس امر پر غور کریں کہ تقدیر اُمت کا رخ کیا ہے اور اگر اقبال کے بقول یہ کیفیت ہے کہ

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتش خود در دل دیگر زنند

تو ہم پاکستان کے تخیل کے بانی اور مفکر پاکستان کے ارشادات کی روشنی میں تقدیر اُمت کی بہتری کے وسائل تلاش کریں ۔

حضرت علامہ نے ''پیر و مرید'' میں اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے :

مرید ہندی

زندہ ہے مشرق تری گفتار سے
آمتیں مرتی ہیں کس آزار سے

پیر رومی

ہر ہلاک آمت پیشیں کہ بود
زانکہ بر جندل گماں بردند بود

(بال جبریل ۱۸۴)

(مجلہ' لیل و نہار ، لاہور ، ۱۹ اپریل ۱۹۶۴ء)

———

قائدین ملت — اقبال کا معیار

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد کے اجلاس کے صدارتی خطبہ میں علامہ اقبالؒ نے اس بات پر زور دیا تھا کہ فرقہ وارانہ مسائل کا مستقل حل یہ ہے کہ برطانوی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مسلمانوں کو یہ اہم بات سمجھائی تھی کہ وہ واقعات کی رفتار پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی تیاری کریں۔ بدقسمتی سے ان کے خطبہ کا یہ حصہ گمنامی اور بے توجہی کی نذر ہوگیا۔ حالانکہ اقبال کی تجویز کا ایک حصہ مکمل ہو جانے یعنی قیام پاکستان کے بعد اہل پاکستان کے لیے لازم تھا کہ ان کوتاہیوں کو پیش نظر رکھیں، جن کی طرف اس زمانے کے مسلمان مفکروں نے اشارے کیے تھے اور جن کی بنا پر علامہ مرحوم نے فرمایا کہ مجھے صفائی کے ساتھ یہ بات کہنے دیجیے کہ ہندی مسلمان آج دو خرابیوں سے دوچار ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ قوم میں قحط الرجال ہے۔ حضرت علامہ نے دو ہم عصر انگریز حکام یعنی سر مالکم ہیلی اور لارڈ ارون کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ ان دو انگریزوں نے علیگڑھ یونیورسٹی سے خطاب کرتے وقت بالکل ٹھیک کہا تھا کہ اب مسلمان قوم قائد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئی ہے۔ اسی نکتہ کی مزید تشریح کرتے وقت

علامہ اقبالؒ نے لفظ قائد کی تعریف ان الفاظ میں کی :

''میرے نزدیک مسلمانوں کے قائد وہ لوگ ہیں - جو خدا داد لیاقت اور اپنے تجربوں کی بدولت اسلام کی روح اور مقاصد اسلام کا شعور رکھتے ہوں - نیز تاریخ کے عصری تقاضوں سے بھی باخبر ہوں - یہی لوگ قوم کی روح رواں ہوتے ہیں - انھیں خدا کا عطیہ سمجھنا چاہیے - کیونکہ اس قسم کے آدمی اپنی مرضی سے پیدا نہیں کیے جا سکتے -''

علامہ اقبالؒ زندگی بھر نہایت خلوص سے قائدوں کی ان خصوصیات کا اعلان کرتے رہے - وہ ان اشخاص کو کہیں مردِ حر، کہیں مردِ کامل، کہیں مردِ حق آگاہ، اور کہیں بندۂ مومن کے خطاب سے یاد کرتے تھے - ایسے ہی اشخاص کے متعلق وہ اپنے اشعار میں جا بجا اشارے کرتے ہیں :

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی
ترا او بیند او را تو نہ بینی !

بخود محکم گزر اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحرِ نورش !

حفظ قرآن عظیم آئین تست
حرف حق را فاش گفتن دین تست

(جاوید نامہ ۹۵)

دل بآیات مبین دیگر ببند
تا بگیری عصر نو را در کمند

علامہ مرحوم نے ۱۹۲۹ء میں مدراس کے مسلمانوں سے

خطاب کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک روحِ اسلام کے کیا معنی تھے:

''مسلمان نے ہمیشہ گرد و پیش کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت کے عنصر کو اپنے اندر جذب کرکے اسے اپنے مذہبی نقطۂ نظر کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا - ہورٹن کے بقول ۸۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک اسلام میں تقریباً ایک سو نظام پیدا ہوئے - اسلام کی فطرت میں قدرت نے جو لچک رکھی ہے - اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا - اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اولین مسلم مفکر کبھی غور و فکر سے خالی نہیں رہے - مسلمانوں کے ادبیات اور افکار کا گہرا مطالعہ کرنے کی بدولت یہ یورپی مستشرق یعنی ہورٹن جو نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوا وہ یہ تھا کہ روح اسلام وسیع و عمیق ہے کہ علمی حیثیت سے اسے بے کراں تسلیم کرنا پڑے گا - ملحدانہ نظریات کے سوا اس نے گرد و پیش کے لوگوں کے تمام صالح نظریات کو جذب کرکے انھیں اپنی مخصوص ارتقائی سمت عطا کی -''

(خطبات صفحہ ۱۶۴)

علامہؒ نے مسلمانوں کے حقیقی قائد کے اوصاف میں یہ صفت بھی شامل کی ہے کہ اسے اسلام کے مقاصد کا صحیح شعور و ادراک حاصل ہو - انھوں نے اپنے اشعار ، نیز خطبات وغیرہ میں اس موضوع کی جا بجا وضاحت کی ہے اور ان بے پایاں امکانات سے بحث کی ہے جو قرآن حکیم میں پوشیدہ ہیں - خطبات میں ایک اور جگہ انھوں نے یہ اشارہ کیا ہے کہ

''قرآن کا بلکہ یوں کہیے کہ اسلام کا خاص مقصد ہی یہ

ہے کہ ذات خداوندی اور کائنات کے ساتھ انسان کے جو تعلقات و روابط ہیں ان کا صحیح شعور انسان کے دل میں پیدا کرے ۔ قرآن حکیم کی ان بنیادی اور لازمی تعلیمات کے اسی پہلو سے متاثر ہو کر ایک مرتبہ گوئٹے نے ایکرمن سے ایک عمومی تبصرہ کے ضمن میں کہا تھا کہ یہ تعلیم ہمیشہ کامیاب رہتی ہے ۔ ہم یا اور کوئی قوم اپنی تمام فکری رفعتوں کے باوجود اس سے بہتر تعلیم پیش نہیں کر سکتے ۔''

(خطبات صفحہ ۹)

آئیے اب اس دوسری خرابی پر غور کریں جو علامہ اقبالؒ کے نزدیک مسلمانوں کو تباہ کر رہی تھی ۔ الہ آباد کے ۱۹۰۲ء والے خطبے میں انھوں نے فرمایا :

''دوسری خرابی جس میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں یہ ہے کہ ان کا باہمی اتحاد اور یک جہتی بہت تیزی سے ختم ہو رہی ہے ۔ اس انتشار کے ہاتھوں یہ حال ہو گیا ہے کہ ان کے افراد اور مختلف گروہ ملت کے فکر و عمل کی بہبود سے عاری ہو کر بہت بے باکی سے اپنے اپنے راستوں پر چل کھڑے ہوئے ہیں ۔''

قومی اتحاد اور یک جہتی پر علامہ اقبالؒ نے سینکڑوں اشعار لکھے ہیں ۔ انھوں نے جا بجا ان افراد کی مذمت کی ہے جو ذاتی نفع کی خاطر یا انفرادی مقاصد کے حصول کے لیے فلاح قوم کو نظرانداز کر دیتے ہیں ۔ یک جہتی اور ہم آہنگی کا درس دینے کے ساتھ ساتھ اسی دور میں علامہ اقبالؒ ایک آزاد اسلامی مملکت کا تصور بھی قائم کر رہے تھے ۔ اب

انہیں عالم فانی سے گزرے ہوئے ۳۰ سال ہوگئے ہیں۔ ۲۱ سال ہوئے کہ ان کا سنہری خواب یعنی پاکستان بھی عالم وجود میں آ چکا ہے۔ قدرتاً یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے اس محسن اعظم نے جو تصورات پیش کیے تھے، انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم نے کیا کچھ کیا ہے، نیز ان کے خیالات کی کس حد تک پیروی کی ہے، مسلمان اپنی قوم کے قائد میں جو صفات دیکھنا چاہتے ہیں، علامہ نے انہیں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ آپ کو بھی غالباً اس بات سے اتفاق ہوگا کہ خوش قسمتی سے ہمیں ایسے قائد ضرور ملے جن میں خداداد قائدانہ صلاحیتیں تھیں۔ نیز ان کی صلاحیت کو تجربے نے بھی پختہ کر دیا تھا اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم ہرگز پاکستان حاصل نہ کر سکتے تھے۔

اس معیار کے مطابق قائداعظم محمد علی جناح ہمارے بہترین اور سب سے قابل رہنما تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ قائداعظم کے علاوہ ہمارے دوسرے قائد بھی اسلام کی روح اور مقاصد عالیہ سے آشنا تھے۔ اس کے دوش بدوش انہیں موجودہ تاریخ کے رجحانات کا بھی پورا شعور تھا۔ باین ہمہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حصول پاکستان کے بعد کچھ ایسے اسباب ضرور پیدا ہوئے جن کے باعث ہم ان مقاصد سے ہی منحرف ہوگئے جن کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان مقاصد عالیہ کو جناب جسٹس حمود الرحمٰن صاحب نے ''آئین پر ایک نظر'' کے عنوان سے نہایت صحت اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ ''مطالبہ پاکستان سے برصغیر کے مسلمانوں کا

مقصود یہی تھا کہ ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین مل جائے جہاں ہم اسلام کی تعلیم اور تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔

اس مقصود و مدعا کے حصول میں جو چیز حائل ہوگئی وہ غالباً یہ تھی کہ یک جہتی اور ہم آہنگی کا وہ جذبہ جو حصول پاکستان سے پہلے مسلمانوں کے دل میں موجزن ہوکر ان کی روح کو سرشار کر رہا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد کسی حد تک کمزور ہوگیا۔ واضح رہے کہ یکدلی اور ہم آہنگی کا جذبہ مجرد صورت میں باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ دراصل ملت کی اُمنگوں اور عزائم کا ترجمان ہوتا ہے اور معاشرے کی مادی، اخلاق اور روحانی فضا کے بہتر یا بدتر ہونے کے ساتھ بتدریج بڑھتا رہتا ہے یا زوال پذیر ہو جاتا ہے۔

''یہ جذبہ عروج پر ہو تو افراد قوم میں اتحاد و اخوت پیدا کرتا ہے وہ اپنے قائد کا احترام کرتے ہیں اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ باہم متحد رہتے ہیں۔ اپنے خاندان قبیلے یا جماعت کی انفرادیت قائم رکھنے کے باوجود ان میں اتحاد فکر اور اتحاد مقصد کا جذبہ کارفرما رہتا ہے''۔ جسٹس حمودالرحمٰن صاحب نے پاکستان کے مسلمانوں کے حالات کا تفصیلی جائزہ لے کر انہیں یہ اُمید افزا پیغام دیا ہے کہ:

''جب یک جہتی و ہم آہنگی کے جذبے سے ہر قسم کے افراد ایک مرکز پر جمع ہوکر اتحاد و اخوت کے دائرے میں آ سکتے ہیں تو اہل پاکستان کا متحد ہو جانا بھی مشکل نہیں۔ ہمارا ایک ہی مذہب ہے۔ ہماری روحانی اور ثقافتی میراث مشترک ہے اور نظریاتی مملکت کے متعلق ہماری اُمنگیں یکساں ہیں۔ میں ہرگز یہ بات تسلیم

نہیں کر سکتا کہ پاکستان کے دو حصوں کے باشندوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ۔ البتہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ دونوں حصوں کے باشندے ہمدردی اور مفاہمت سے کام لے کر ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کریں اور دونوں حصوں کی اقتصادی رفتار ترقی میں جو نمایاں فرق ہے اور جس کی وجہ سے دونوں میں بے اطمینانی پیدا ہو کر احساس محرومی کی صورت اختیار کر رہی ہے ۔ اسے دور کرنا چاہئے ۔''

معاشی مساوات کا یہ نسخہ جو جسٹس صاحب موصوف نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے باشندوں کو متحد کرنے کے لیے تجویز کیا ہے ۔ یقیناً نہایت مفید اور کارگر ہے ۔ تاہم راقم کا خیال ہے کہ معاشی عدم مساوات جس کے ہاتھوں بعض اشخاص بے حد نادار یا بعض بہت زیادہ مالدار ہو گئے ہیں ۔ پورے پاکستان میں پھیلی ہوئی ہے ۔ لہٰذا مناسب یہ ہوگا کہ معاشی مساوات جاری کرنے کا یہ اصول تمام افراد اور تمام جماعتوں پر نافذ کیا جائے ۔ اس سے بھی لوگوں کے دلوں میں متحدہ قومیت ، یک جہتی ، ہمدردی اور ہم آہنگی کے جذبات نشو و نما پائیں گے ۔ جسٹس صاحب موصوف کے حکیمانہ دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ

''منصوبے کے مطابق دونوں حصوں کی معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ ملی اتحاد اور قومی یک جہتی کے تازہ احساس کی تولید اور ارتقاء ایک لابدی شے ہے اور اسی سے سیاسی استحکام کا راستہ بھی ہموار ہوگا ۔''

ایران کے ایک معروف معاصر مفکر آقای تقی زادہ نے بھی اسی نوع کا تبصرہ افکار اقبالؒ کی روشنی میں کیا ہے :

''دنیائے اسلام اقبالؒ کی ممنون احسان ہے کہ انھوں نے اسلامی اتحاد کے تصور کو ایک نئی زندگی ، ایک نئی تاب و تواں اور نئی حرکی قوت عطا کی ۔ یہ ان ہی کے حیات افروز افکار کا نتیجہ تھا کہ مملکت پاکستان کا قیام ظہور میں آیا ۔ اقبالؒ کے افکار محض حکیمانہ نظریات اور دقیق مابعد الطبیعی مسائل ہی تک محدود نہیں ، وہ افراد ملت کی مادی ترقی اور نشو و نما کے بھی اسی شد و مد سے قائل تھے جتنے وہ انسانی خودی کی تہذیب و ترقی میں یقین رکھتے تھے ۔

(آقای تقی زادہ ، ایران)

(نوائے وقت ، لاہور ، ۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء)

علامہ اقبالؒ کے اجداد

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال سے ایک ملاقات ہوئی جس کے بعد انھوں نے ٹیلیفون پر راقم کو علامہ اقبالؒ کا ایک غیر مطبوعہ خط پڑھ کر سنایا جو انھوں نے اپنے بھائی شیخ عطا محمد کو ۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو لکھا ہے اور اب شیخ عطا محمد صاحب کے صاحب زادے شیخ اعجاز احمد کے پاس محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس اس کا عکس ہے۔ اس خط میں علامہؒ نے لکھا ہے کہ جاوید آج پورے ایک سال کا ہوگیا ہے اور یہ کہ مجھے اعظم دیدہ مری کی کتاب سے حاجی بابا لولی کا سراغ مل گیا ہے جو مشائخ میں سے تھے اور ہمارے جد اعلیٰ تھے۔ اس خط میں یہ بھی درج ہے کہ علامہ کے آباؤ اجداد کی سکونت کشمیر کے موضع چکو پرگنہ آدؤن میں تھی۔۔۔

علامہ مرحوم کے تذکرہ نگاروں نے کسی حوالہ یا استناد کے بغیر جو بیانات دیے ہیں ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

''شیخ صاحب کو کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے۔۔۔ شیخ صاحب کے جد اعلیٰ قریباً سوا دو سو سال ہوئے مسلمان ہوگئے تھے۔ گوت ان کی 'سپرو' ہے۔ (منشی محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار

کشمیری ، لاہور ۔ نیرنگ خیال ستمبر ، اکتوبر ۱۹۳۲ء
میں شائع شدہ مضمون ، ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال)''۔

فوق کا حوالہ دیتے ہوئے صوفی غلام محی‌الدین نے اپنی کتاب Kashmir (جلد اول ، ص ۱۷۳) میں لکھا :

> "The Brahmans who first took to the study of Persian and Muslim learning in Kashmir were the Saprus, the fore-fathers of the caste that produced the late Sir Mohammad Iqbal whose family embraced Islam in the days of Aurang Zeb Alamgir, and migrated to Sialkot".

یہ بیان فوق کے اس بیان سے ذرا مختلف ہے ۔ جس تک میری رسائی ہوئی ہے اور جو میں نے اوپر نقل کیا ہے ۔ ممکن ہے فوق نے یہ مختلف بیان کسی اور جگہ دیا ہو ، لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹر صوفی غلام محی‌الدین نے جو حوالہ دیا ہے وہاں یہ چیز موجود نہیں ۔

پھر عبدالسلام ندوی نے اپنی تالیف ''اقبال کامل'' (صفحہ ۲ ، ۳) میں ۱۹۴۸ء میں لکھا ہے :

''ڈاکٹر صاحب کی گوت یعنی ذات سپرو ہے لیکن سوا دو سو سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا ۔ ڈاکٹر صاحب کے جد اعلیٰ ایک بزرگ کی عقیدت کی وجہ سے مشرف بہ اسلام ہو کر سیالکوٹ چلے آئے'' ۔ عبدالسلام ندوی نے بھی کوئی سند پیش نہیں کی ۔

معروف مستشرق اور بہاری اور پاکستان کی عزیز دوست ڈاکٹر اینا میری شمل نے ۱۹۶۲ء میں اپنی کتاب (صفحہ

نمبر ۳۵) (Gabriel's Wings) میں لکھا :

"Iqbal's family came from Kashmir, hence he often alludes to the fact that he is 'A son of Kashmiri Brahmans' but acquainted with the Wisdom of Rumi and Tabriz".

ڈاکٹر شمل نے حاشیے میں مندرجہ ذیل اشعار سے استفادہ کیا ہے :

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است
(زبور عجم، ص ۱۷)

اگرچہ زادۂ ہندم فروغ چشم من است
ز خاک پاک بخارا و کابل و تبریز
(پیام مشرق ، ص ۲۰۳)

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است
(پیام مشرق ، ص ۲۱۴)

ظاہر ہے کہ دوسرے شعر سے حضرت علامہؒ کا نہ کشمیری ہونا ثابت ہے نہ برہمن زادگی کا تصور ملتا ہے ۔

ویسے دیگر حضرات نے علامہؒ کے مندرجہ ذیل اشعار بھی سند کے طور پر اس سلسلے میں نقل کیے ہیں :

میر و مرزا بہ سیاست دل و دین باختہ اند
جز برہمن پسری محرم اسرار کجاست

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے
اس باغ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے

ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

("حیات اقبال کا ایک پہلو" از جناب محمد عبداللہ قریشی صاحب مطبوعہ - (روزنامہ امروز ، ص ۱۰ ، ۱۱ مارچ ۱۹۵۳ء) -

علامہ" اور دیگر حضرات کے بیانات سے یہ اطلاعات میسر آتی ہیں کہ :

(ا) ان کے جد اعلیٰ حاجی بابا لولی تھے -

(ب) یہ کشمیری برہمن تھے اور ان کی گوت سپرو تھی -

(ج) ان کے اجداد فوق کی تحریر کے وقت یعنی ۱۹۳۲ء سے سوا دو سو سال پہلے کشمیر سے نقل مکانی کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے -

(د) بابا لولی کی اولاد میں شیخ محمد اکبر ایک با عمل صوفی تھے جن کے تقدس و اتقا کا بڑا شہرہ تھا - انھوں نے کئی دفعہ پنجاب کا سفر بھی کیا - ان کی چوتھی پشت میں چار بھائی شیخ محمد رمضان ، محمد رفیق اور عبداللہ وغیرہ - افغانوں کے عہد میں کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے اور سیالکوٹ میں مقیم ہوئے - ان کے والد چونکہ کشمیر ہی میں رہے اس لیے سیالکوٹ میں کسی کو ان کا نام معلوم نہیں ہو سکا -

(محمد عبداللہ قریشی صاحب محولہ بالا مضمون میں)

ان سب زاویوں میں سے سب سے معتبر روایت حضرت علامہ اقبالؒ کی اپنی ہے اور دوسرے راوی منشی فوق صاحب ہیں جو علامہؒ سے بکثرت ملتے تھے اور انھوں نے ان کی زندگی میں ہی ۱۹۳۲ء میں بیان دیا تھا جو لابدی طور پر علامہ کی نظر سے گزرا۔

ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کی ہدایت پر راقم نے علامہ اقبالؒ کی ان کے جد اعلیٰ کی نشاندہی کے منبع کو دیکھا تو اس میں ریشیوں کے باب میں تاریخ کشمیر اعظمی (واقعات کشمیر) کے مؤلف خواجہ محمد اعظم شاہ دیدہ مری نے ۱۲۶۹ھ میں بابا لولی حاجی کے متعلق یہ اندراج کیا ہے:

بابا لولی حاجی

از ساکنان موضع چکو پرگنہ آدؤن بود۔ زنی خواستہ بود۔ وقت صحبت زنش خوش نکردہ۔ خلع بمیان آمد۔ این معنی موجب برودت دلش از دنیا شد۔ راہ کعبہ گرفت۔ دوازدہ سال سیاحت کردہ بہ کشمیر آمدہ باشارت غیبی مرید حضرت بابا نصرالدین شد و بقیہ عمر در خدمت و صحبت او گزرانید۔ وقت رحلت در آستانہ چرار در جوار پیر بزرگوار آسود۔ (ص ۷۲)

اعظم دیدہ مری سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ابو محمد حاجی محی الدین مسکین نے ۱۳۲۱ھ میں اپنی مشہور تالیف تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار (تاریخ کبیر کشمیر) ترتیب دی ہے۔ اس میں پھر ریشیوں کے باب میں درج ہے۔

لولی حاجی

ولادتش در موضع چکو حلبند(؟) پرگنہ آدؤن بود۔ ہر دو

چشم و پایش کج بودند ـ پس او مرا داعیهٔ تزویج بظہور آمد و بازنی عقد نکاح بر بست ـ چون منکوحہ اش صورت ویرا بدید و بخندید، دل بابا از وی متنفر گردید ـ پس کمر ہمت بر بستہ برآمد ـ سفر زیارت حرمین شریفین نمود ـ و پس از تشریف یابی بزیارت مبارک چون مراجعت بجانب کشمیر کرد ـ و در خدمت بابا نصرالدین روی ارادت آوردہ گوی تجرید و تفرید ربود ـ چون رحلت کرد در مقبرهٔ مرشد آسود و بعض نوشتہ اند کہ در قریهٔ زالرہ پرگنهٔ کامراج مدفون است ـ

(صفحہ ۱۲۳ - ۱۲۴)

مسکین کا بیان اعظم دیدہ مری سے قدرے مختلف ہے اور دونوں یہ نہیں بتاتے کہ انہوں نے یہ مواد کہاں سے حاصل کیا ہے ـ ہمیں یہ بھی اطلاع نہیں ملتی کہ حضرت علامہؒ کو یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں کہ شیخ بابا لولی حاجی ان کے جد اعلیٰ تھے ـ اس کے ساتھ ہی یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ :

(۱) شیخ محمد اکبر کا اپنے جد اعلیٰ بابا لولی حاجی سے کیا رشتہ تھا ؟

(۲) حضرت علامہؒ نے اپنے آپ کو برہمن اور منشی فوق نے انھیں کیسے سپرو قرار دیا ؟

ویسے یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ گو بابا لولی حاجیؒ یا ان کے معروف مرشد بابا نصرالدینؒ کا ذکر تاریخ کشمیر میں زمرۂ ریشیان میں ملتا ہے۔ لیکن دراصل ریشی کوئی ذات یا گوت نہ تھی ـ چنانچہ مسکین لکھتا ہے کہ :

'لفظ ریشی از لفظ رکھی کہ در اصطلاح سنسکرت تارک دنیا و مشغول بیاد خدا را گویند و آنکہ این لفظ را عربی یا فارسی قرار داده است و در آن تاویلات نموده پی باصلیت این لفظ نبرده است ۔ و معہذا این لفظ در زبان کشمیری مستعمل است و زبان کشمیر از لغات و السنہ' کثیر مرکب است ۔ چون کہ پیشتر درین خطہ زبان سنسکرت مروج بود بنا برآن لغایت حال بہم اکثر الفاظ بر السنہ' ساکنان این دیار جاریست ۔ و اہل اسلام معنی آن لفظ را بدینگونہ بیان کردہ اند : کہ مراد از ریشی شخصی است کہ اولاد و ازواج و مال و متاع و امتعہ و اقمشہ و اراضی و مواشی وغیرہ را ترک دادہ ' زہد و ریاضت و تقوی و عبادت و محنت بائی شاقہ بکار برد و در کوہ و غار با سکونت نماید و کسی را از آدمیان و حیوانات و وحوش و طیور و ہوام بلکہ بہ رستنیہا کہ از زمین میروید ایذا نرساند و بجناب حق سبحانہ و تعالی بادای فرائض و واجبات و بادای سنن و نوافل و بالتزام سکوت و خلوت و جوع و سہر تقرب جوید و صدق و صداقت و ذکر و فکر و خضوع و خشوع و حضور قلب وسیلہ' خود سازد ۔ ۔ ۔ ۔''

جن ریشی زہاد کا ذکر تواریخ کشمیر میں درج ہے ۔ ان میں سے کچھ لوگ راجپوت بھی تھے ۔ چند میر ، بٹ اور زمیندار تھے ۔ اس لیے اگر علامہ اقبال کے جد اعلی حاجی بابا لولی ؒ ریشی کہلائے تو اس سے ان کی گوت پر اثر نہیں پڑا ۔ البتہ اس وقت کافی مستند مواد میسر نہ آنے کی وجہ سے چند سوال تشنہ' جواب رہ جاتے ہیں کہ :

(۱) حضرت علامہ اقبال کا اپنے جد اعلی حضرت حاجی بابا لولی ؒ سے مستقیماً کس پشت سے رابطہ قائم ہوتا ہے؟

(۲) شیخ محمد اکبر کون سی پشت سے حضرت بابا لولیؒ سے متعلق تھے ؟

(۳) حضرت علامہ اقبالؒ کی گوت سپرو کس طرح معین کی گئی ؟

راقم کا خیال ہے کہ اگر اس سلسلہ میں مزید تفحص کیا جائے تو اس سلسلے کی مزید کڑیاں مل سکتی ہیں ۔ بہر صورت میں ان احباب کا شکرگزار ہوں گا جو میری راہنمائی فرمائیں ۔ تاکہ جو مواد اس وقت تک لوگوں کے پاس محفوظ ہے وہ تو یکجا جمع ہو جائے ۔ یہ اضافہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ صرف علمی ہے ۔ اقبالؒ بہر صورت اقبال ہے اور پاکستان نہیں بلکہ عالم اسلام فکری اعتبار سے اس کا مدیون ہے ۔ اس کے بزرگوں کے اذکار یا اس کی گوت کے تعین سے اقبال کے ان احسانات میں کوئی فرق نہیں پڑتا جو ملت اسلامیہ پاکستان پر اس نے کیے ہیں ۔ اور جو ہماری فکری تاریخ کا نہایت تابناک حصہ ہیں ۔ اس سلسلے میں عزیز گرامی جناب ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال بھی میرے ہمنوا ہیں، جو نسبی تفاخر کے لیے نہیں بلکہ صرف علمی اعتبار سے اس مسئلہ میں دلچسپی رکھتے ہیں اور انھی کے ایماء پر میں نے اپنی بساط کے مطابق وہ معلومات یکجا کر دی ہیں ، جن تک میری رسائی ہوئی ہے ۔

(نوائے وقت ، لاہور ، ۲۱ اپریل ۱۹۷۴ء)

اقبال — جمہوریت — اسلام

حضرت علامہ اقبال مسلم انشورنس کمپنی کے بانیوں میں سے تھے - یہ چند سطور اسی کمپنی کے کارکنوں کی ترتیب دی ہوئی ایک مجلس میں ۶ مئی ۱۹۷۲ء کو پیش کی گئیں -

سوال یہ نہیں ہے کہ علامہ اقبالؒ سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے - وہ بہر صورت ایک مفکر تھے - آپ کہتے ہیں وہ غلط بھی سوچ سکتے تھے - میں آپ کو یہ کہنے کا حق دینا چاہتا ہوں - میں تو آپ کو یہ حق بھی دیتا ہوں کہ آپ کہیں کہ پاکستان بننا نہیں چاہیے تھا یا یہ کہ پاکستان غلط بنا ہے بلکہ میں آپ کے ساتھ شامل ہو کر یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ پاکستان کئی اعتبارات سے غلط بنا ہے - ہماری عمر کی نسل اس بات کی گواہی دے گی کہ جب پاکستان بن رہا تھا تو ہر ہندی مسلمان کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ پاکستان میں ایسا اسلامی نظام حیات جاری کیا جائے گا - جو رسول کریمؐ کے عہد مبارک کی یاد تازہ کر دے گا - بننے والے پاکستان میں دودھ اور شہد کی نہریں نہیں چلیں گی - لیکن او امر و نواہی کی پابندی اس طرح ہوگی کہ ہر ابن آدم سے اسلامی نقطۂ نظر سے معاشی اور معاشرتی عدل و انصاف روا رکھا جائے گا لیکن تا دمِ تحریر ان گنہگار آنکھوں نے یہی دیکھا

کہ اس معاشی اور معاشرتی انصاف کا دور دور تک پتہ نہیں ملتا ۔ جس کا خواب ۲۵ سال پہلے دکھایا گیا تھا ۔ بلکہ انسانی زندگی کا وہ شرف بھی اس سے چھین لیا گیا ہے جو اسے خدائے پاک نے ودیعت کیا تھا ۔ اسی لیے غالباً وہ مسلمان بھی صحیح تھے ۔ (اور عجیب بات یہ ہے کہ اب وہ جبن اور خوف کی وجہ سے اس سے منکر ہوگئے ہیں) جو علانیہ طور پر پاکستان کی تاسیس کی مخالفت یہ کہہ کر کرتے تھے کہ اگر پاکستان ہندی مسلمان کو آئین رسول مختار کا حامل بنانے کے بغیر بنا لیا گیا تو یہ پاکستان نہیں چلے گا ۔ آج ان کی بات درست ثابت ہوئی ہے ۔

لیکن اختلاف رائے اور انکار اقبال ایمانداری سے ہونا چاہیے ۔ یہ کچھ مناسب بات نہیں کہ آپ اقبال کا نام لے کر ان خیالات اور جذبات کی تبلیغ کریں ۔ جو اقبال کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے ۔ پھر اس تبلیغ سے پاکستان کی وہ تصویر بنانے کی کوشش کریں جو آپ کے ذہن میں ہے ۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اقبال بہر صورت ایک مفکر تھے ۔ آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہندی مسلمانوں کے ہمدرد تھے ، آپ کو اس سے بھی انکار نہیں کہ حب رسول مقبول میں وہ کسی مسلمان سے کمتر نہیں تھے اور اسلامی شعار کے شیدائی تھے ۔ ان حقائق کو سامنے رکھ کر آپ یہ سوچیں کہ ملی اور بین الملی سطح پر اقبال نے بننے والے پاکستان کے خد و خال کیا معین کیے تھے تو نہایت آسانی سے ان کی تحریروں میں آپ کو اس سوال کا جواب مل جاتا ہے اور یہ خد و خال ایسے نہیں جن کو دیکھنے کے بعد آپ کسی شبہ میں رہ جائیں کہ پیدا ہونے والے پاکستان کی شکل کیا ہوگی ۔

اقبال نے جس دور میں پاکستان کے متعلق سوچنا شروع کیا تھا ۔ اس وقت وہ واضح طور پر ترانۂ ہندی کی اس طرز فکر سے ہٹ چکے تھے ۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

یا یہ کہ

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اور

ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور اسی لیے ایک گفتگو میں حضرت علامہ نے واضح طور پر کہا :

''میں سماجی اتحاد کے لیے وطن کو ایک بنیاد سمجھتا تھا ۔ اس لیے خاک وطن کا ہر ذرہ مجھے دیوتا دکھائی دیتا تھا ۔ اس وقت میرے خیالات مادیت کی طرف مائل تھے ۔ سوائے وطن کے مجھے انسانوں میں اتحاد کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ دکھائی نہیں دیتا تھا ۔ اب میں انسانوں کو صرف ازلی اور ابدی روحانی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتا ہوں اور جب بھی میں اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد اس سے یہی روحانی نظام ہے ۔''

ملت از آئین حق گیرد نظام
از نظام محکمی خیزد دوام

ہست دین مصطفیٰ دین حیات
شرع او تفسیر آئین حیات

میں اس واقعہ کو صحیح سمجھتا ہوں کہ اقبال نے اجتماعی جمہوریت (social democracy) کی تبلیغ کی تھی اور ۱۹۳۸ء میں واضح طور پر قائداعظمؒ کو ایک خط میں لکھا تھا : سوشل ڈیماکریسی (اجتماعی جمہوریت) کسی سوزوں شکل اور اسلام کے فقہی اصولوں کے مطابق کوئی انقلابی چیز نہیں ۔ بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع ہے ۔ یعنی سوشل ڈیماکریسی کی طرف اپنی رغبت ظاہر کرتے ہوئے بھی اقبال کسی ایسی اشتراکیت کی حمایت نہیں کر رہے تھے ، جس کا تعلق کسی اس ازم سے تھا ، جس سے کھینچ تان کر آج پاکستان میں بعض مکاتبِ فکر کے لوگ فکرِ اقبال کو ملا رہے ہیں ۔ اقبال صرف ایسی سوشل ڈیماکریسی کے نفاذ کے حامی تھے ۔ جس کا منبع الہام اسلام کی شرع اور فقہی اصول ہوں ۔ اقبال کسی ازم سے اپنی اور ملت کی نجات کا راستہ تلاش اور طلب کرنے کے بغیر واضح طور پر اس بات کے قائل تھے کہ اگر ملک میں کسی ایسی سوزوں جمہوریت کو رواج دیا جائے ۔ جس کی بنیاد اسلام پر رکھی جائے تو ہمارے تمام معاشی اور معاشرتی مسائل بہ آسانی حل ہو سکتے ہیں ۔

یہ بات میں نے آپ سے ۱۹۳۸ء کے خط کے حوالے سے کی ہے ۔ لیکن اس سے بہت پہلے اقبال بڑی دردمندی سے عوام اور استحصال شدہ کاشت کاروں کی فلاح و بہبود کے منصوبے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے بنا رہے تھے ۔ ۱۹۲۶ء میں جب وہ پنجاب کی قانون ساز مجلس کے رکن منتخب ہوئے تو گورنمنٹ نے نیلی بار ضلع منٹگمری میں سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ فروخت کیا تھا جس کا زیادہ تر حصہ سرمایہ داروں نے خریدا تھا ۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی روداد اس کی گواہ

ہے کہ علامہ اقبال نے کونسل میں یہ تحریک کی کہ اس زمین کا کم از کم نصف حصہ ان کسانوں کے لیے وقف کیا جائے جو اپنے ہاتھ سے کھیتی باڑی کرتے ہیں۔

اسی کونسل میں ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلہ پر پرزور بحث کی کہ زمینیں گورنمنٹ کی ملکیت ہوتی ہیں یا قومیں ان کی مالک ہوتی ہیں۔ علامہ نے اس نظریہ کی شدید مخالفت کی کہ ساری زمین حکومت کی ملکیت ہوتی ہے اور فرمایا کہ اس ملکیت عامہ کا دعویٰ نہ عہد قدیم میں کسی نے کیا اور نہ سلاطین مغلیہ کے زمانے میں ایسا مطالبہ پیش کیا گیا۔ اور اگر کسی وقت کسی ملک کے اندر یہ نظریہ رائج بھی تھا تو اس بیسویں صدی میں اسے جائز نہیں مانا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس نظریہ پر سب سے پہلے جس یورپین مصنف نے تبصرہ کیا وہ پیرن تھا۔ ۱۸۸۷ء میں اس نے پوری تحقیق و تفتیش کے بعد اس نظریہ کو بالکل مسترد کر دیا۔ ۱۸۳۰ء میں بریگر نے ہندوستان کے اندر ملکیت کے قانون و رواج کی پوری تحقیقات کی۔ یہ مصنف اپنی کتاب میں منو کے قوانین، اسلامی شریعت اور ہندوستان کے مختلف حصوں بنگال، مالوہ، پنجاب وغیرہ کے متعلق رواجی پابندیوں کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تاریخ ہند کے کسی دور میں بھی سلطنت زمین کی ملکیت کی مدعی نہیں ہوئی۔ اس ساری توضیح سے ڈاکٹر صاحب کا مقصد یہ تھا کہ زمین کی ملکیت خدا کی تسلیم کی جائے۔ انسان کو ذات باری کا نائب اور خلیفہ مانا جائے اور زمین خود کاشت کرنے والے کسان کی مانی جائے اور اس سے حسب استطاعت لگان لیا جائے اور بے استطاعت لوگوں سے کوئی لگان نہ لیا جائے۔

اب ڈاکٹر صاحب کے ان افکار کو حالیہ اور رائج اشتراکیت کی طرف کھینچ کر لے جانے کی جو مساعی کی جا رہی ہیں ، اور ان مساعی سے ہر موقع پر اسلام کی جو نفی کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یا تو ایسا کرنے والوں کی کم علمی یا بے علمی ہے ، یا ان توضیحات کے پیچھے کچھ اور قوتیں کارفرما ہیں، جو اس پر مصر ہیں کہ نام اقبال کا لو لیکن اسلام سے اس کا اور پاکستان کا رشتہ یہ کہہ کر توڑ دو کہ اقبال خود بہت بڑی اشتراکی سوچ کا علمبردار تھا ۔ غالباً انھی کے متعلق اقبال نے کہا تھا :

سمجھ میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

(نوائے وقت، لاہور ، ۱۴ مئی ۱۹۷۲ء)

اتحاد عالم اسلام۔اقبال کی سوچ

صرف اسلام اور شریعت محمدی مسلمانان عالم کے اتحاد کے ضامن اور اس کے سنگ بنیاد ہیں

خاک کا ایک ٹکڑا تاریخی طور پر کبھی کول دراوڑوں کی ملکیت رہا ہے ۔ کبھی اس پر آریائی قابض رہے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے مغلوں نے ساڑھے تین سو سال اسے زیر نگین رکھا ہے ۔ پھر سرکار انگلشیہ اس کی مالک بن بیٹھی اور اب یہ ٹکڑا ہندوؤں کے ہاتھ لگا ہے تو وہ آجکل بڑے زور شور سے اس کی تشہیر کر رہے ہیں کہ ہند و پاکستان کے عظیم ترین شاعر حضرت علامہ اقبالؒ بھی اس کے گن گاتے رہے ہیں ۔ اس لیے آئیے ہم بھی اس کی تقدیس کو لازمۂ حیات قرار دیں ۔ یعنی اتحاد کی علامت وطن کو قرار دیں ۔ اتحاد عالم اسلام کے متعلق علامہؒ کی سوچ کے ارتقاء کا احاطہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ ہندو ریڈیو اور ٹیلیویژن آجکل حضرت علامہ کی پیدائش کی صد سالہ سالگرہ منانے کے عذر اور تقریبوں پر ہندی سیاسی فکر کی جو تربیت اور جس انداز میں ہند و پاکستان کے مسلمانوں کے ذہن کو مسموم کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے ، وہ کس حد تک صحیح ہے ۔ کیونکہ جب ہم دنیائے اسلام کے اتحاد کی بات کرتے ہیں تو ہمیں ان لوگوں کو بھی مطمئن

کرنا پڑتا ہے جو علی الاعلان پاکستان اور پاکستان سے باہر کہتے پھرتے ہیں کہ خود اقبال نے بھی تو اپنے گھر یعنی اس وقت کے ہندوستان میں اتحاد کی بنیاد قومیت پر رکھی تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کی صرف ایک اپنی گفتگو کی یاد دلانا چاہتا ہوں، جس میں انھوں نے بڑی وضاحت سے اس امر کی تشریح کی تھی کہ انھوں نے کیوں کہاں تھا:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

وہ فرماتے ہیں:

''میں سماجی اتحاد کے لیے وطن کو ایک بنیاد سمجھتا تھا۔ اس لیے خاک وطن کا ہر ذرہ مجھے دیوتا دکھائی دیتا تھا، اس وقت میرے خیالات مادیت کی طرف مائل تھے، سوائے وطن کے مجھے انسانوں میں اتحاد کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب میں انسانوں کو صرف ازلی اور ابدی روحانی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتا ہوں اور جب میں اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد اس سے یہی روحانی نظام ہے۔''

(مجلۂ اردو، اقبال نمبر، ص ۹۳۹)

اب آپ حضرت علامہؒ کی یہ وضاحت سمجھ کر بھی ان کے عذر اور ذہنی ارتقاء کو تسلیم نہ کریں تو آپ کی مرضی لیکن اگر آپ ان کی بات مان لیں تو پھر آپ سے یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی سوچ رفتہ رفتہ اس مقام محمود تک پہنچ گئی تھی۔ جہاں انھوں نے نہ صرف عالم اسلام

بلکہ اقوام عالم کے اتحاد کا صحیح منبع دریافت کر لیا تھا ۔ اور ان کی عقل سلیم پر یہ راز منکشف ہو چکا تھا کہ وطن ، وطنیت اور قومیت کے عنوان سے یورپ نے بالخصوص مسلمانان عالم میں جس جذبے کی تحریک کی ہے اور ان کے اذہان میں عرب ایرانی ، ترک، افغان وغیرہ بننے کے احساس کی جو آگ بھڑکائی ہے ، اس سے بالآخر انسانیت کا دیوالہ پٹ جائے گا :

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیر ملت کردہ اند

تا وطن تعمیر را شمع محفل ساختند
نوع انساں را قبائل ساختند

مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

اقوام پرستی کی تنقیص کرتے ہوئے اقبال نے اسی لیے کہا تھا ۔

"As an emotional system of unification it (Islam) recognises the Worth of the individual as such, and rejects blood relationship as a basis of human unity" (Reconstruction of Religions thought in Islam).

اقبال نے صحیح نفسیاتی طور پر اس چیز کو بھانپا تھا کہ جب انسان اتحاد کی بات شروع کریں گے تو سب سے پہلے غلط سوچ کے انسان خونی رشتوں کو اتحاد کی بنیاد قرار دیں گے ، حالانکہ اسلام اس کی تردید کرتا ہے ۔ اور اس بات کی

صراحت حضرت علامہ نے سید نذیر نیازی سے گفتگو کے دوران یوں کی :

''اسلام کی نظر فرد کے ذاتی شرف پر ہے۔ حسب و نسب پر نہیں ہے۔ نسل اور رنگ کا اختلاف کوئی عیب کی بات نہیں۔ قرآن پاک نے اس کا شمار آیات اللہیہ میں کیا ہے۔ البتہ ہمیں اس باب میں اقل قلیل مزاحمت سے کام لینا چاہیے۔

اسلام نے شعوب و قبائل کی موجودگی سے انکار نہیں کیا۔ البتہ تفوق اور برتری کی بنا تقویٰ پر رکھی۔''

(اقبال کے حضور، ص ص ۱۴۶، ۱۴۷)

یہ حضرت علامہ کا خیال واضح طور پر ان آیات قرانی پر مبنی تھا۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی و جعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفو (الحجرات ۱۳)

(اے آدمیو ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے بنایا اور تمھاری ذاتیں اور قبیلے رکھے تاکہ آپس کی پہچان ہو)۔

ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (الحجرات، ۱۳)

(تم میں سے اللہ کے ہاں یقیناً اس کی بڑی عزت ہے جس کا اتقا بڑا ہے)۔

لیکن مسلمانوں میں نسلی اور جغرافیائی خیالات اسلام کی تبلیغ کے باوجود کس طرح فروغ پاتے رہے۔ اس کی ایک

تاریخی مثال یہ ہے کہ جعفر برمکی اور عباسہ کے نکاح کی تردید کرتا ہوا ابن خلدون جیسا آزاد خیال مفکر بھی لکھتا ہے :
من جملہ اور بہت سی باتوں کے جن کی بناء پر یہ روایت سر تاسر لغو اور بے بنیاد ٹھہرتی ہے - یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ایک عرب خاتون کی شادی جس کا تعلق خاندان خلافت سے تھا ، ایک ایرانی مرد سے خواہ اس کا مرتبہ کیسا بھی بلند ہو ، کیسے ہو سکتی تھی -

(مقدمہ ابن خلدون)

عرب اور غیر عرب اور پھر جغرافیائی قومیتوں کی بات مسلمانوں میں اس قدر مقبول ہوئی اور اس سے اتحاد عالم اسلام اس طرح تباہ ہوا کہ آج پاکستان جیسے چھوٹے سے ملک میں یہ تبلیغ عام سننے میں آ رہی ہے کہ یہاں بھی چار بلکہ پانچ قومیتیں آباد ہیں - اس تحریک کے قوی ہونے سے پہلے پاکستان اور پھر عالم اسلام کے اتحاد کو کتنا نقصان پہنچے گا ، اس کے متعلق حضرت علامہ کس طرح سوچتے تھے ، اس کی ایک مثال یہ ہے :

ما مسلمانیم و اولاد خلیل
از ابیکم گیر اگر خوابی دلیل
با وطن وابستہ تقدیر امم
برنسب بنیاد تعمیر امم
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ
باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
برنسب نازاں شدن نادانی است
حکم او اندر تن و تن فانی است

ملت با را اساس دیگر است
این اساس اندر دل ما مضمر است

حاضریم و دل بغائب بستہ ایم
پس ز بند این و آن وارستہ ایم

رشتۂ این قوم مثل انجم است
چون نگہ ہم از نگاہ ما گم است

تیر خوش پیکان یک کیشیم ما
یک نما ، یک بین ، یک اندیشیم ما

یعنی مسلمانان عالم کے اتحاد کی بنیاد وطنیت کے محدود مادی تخیل پر قائم نہ تھی ، بلکہ اس کا پہلا جز توحید تھا :

ملت بیضا تن و جاں لا الہ
ساز مارا پردہ گرداں لا الہ

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

توحید کے بعد ملت اسلامیہ کے اتحاد کا دوسرا روحانی عنصر نبوت اور رسالت ہے :

حق تعالٰی پیکر ما آفرید
از رسالت در تن ما جان دمید

اور یہی وجہ تھی کہ حضور رسالت مآب ؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان فرمایا تھا :

''عربی کو عجمی اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے ۔''

اور عربوں کو یہ کہہ کر راہ راست پر رہنے کی تلقین کی تھی :

''خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقے کو مٹا دیا ۔ اب صرف دو طریقے کے آدمی ہیں ۔ مومن پرہیز گار اور بدبخت بدکار ۔ ۔ ۔ ۔ لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں ۔ جو جہنم کا ایندھن ہیں یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے ۔''

اسی لیے اقبال نے کہا :

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

دنیا کے مسلمانوں کے اتحاد کے لیے اسلام کی جو بنیادی اہمیت حضرت علامہ پر روشن تھی ۔ اس کی وضاحت ان کے اس قول سے ہوتی ہے :

''اسلام ہی ہمارا وطن ہے اور اسلام ہی ہماری نسل ، جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے فرمایا تھا ، سلمان ابن اسلام ابن اسلام ۔''

''اسلام قید وطن سے آزاد ہے ۔ اس کا مقصد ہے ایک ایسے انسانی معاشرے کی تشکیل جو مختلف نسلوں اور قوموں کو باہم جمع کرتے ہوئے ایک ایسی امت تیار کرے ۔ جس کا اپنا ایک مخصوص شعور ذات ہو ۔''

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

گویا مسلمان کو اپنے اتحاد کے لیے دنیا میں نسل، وطن اور قومیت کے علاوہ کسی اور چیز کو بنیاد قرار دینا تھا۔

لیکن سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ صداقت اسلام بیان کرکے اقبال جب اسلام کو مسلمانان عالم کا ذریعۂ اتحاد بتاتا ہے تو وہ اسلام کی وضاحت کیا کرتا ہے۔ یہ وضاحت اقبال کی منظومات اور تحریروں میں متعدد جگہ موجود ہے۔ میں یہاں چند ایک مثالیں پیش کرتا ہوں۔

تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے علامہ اقبال نے یورپ روانہ ہونے سے پہلے ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو جو بیان دیا اس میں کہا:

''میں سمجھتا ہوں کہ میں اس سے بہتر اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کو قرآن کریم کے بیان کردہ اصول عمل یاد دلاؤں۔''

یکم مارچ ۱۹۲۲ء کو ٹاؤن ہال لاہور کے باہر باغ میں اقبال کے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت چائے میں کہا:

''میں نے اپنی زندگی کے گذشتہ ۲۵ سال اسلام اور موجودہ تہذیب و تمدن کی تطبیق کی تدابیر کے غور و فکر میں بسر کر دیے ہیں۔''

۱۹۳۳ء میں جب پنجاب کونسل میں سر فضل حسین نے کہا کہ سیاسی پین اسلامزم کا کبھی وجود نہ تھا تو علامہ اقبال نے ۱۹ ستمبر ۱۹۳۳ء کو اخبارت میں ایک بیان شائع کرایا اور پھر ۲۸ ستمبر کو پین اسلامزم کی تشریح کرتے ہوئے کہا:

''پین اسلامزم سے اسلام کی عالمگیر سلطنت بہت مختلف ہے ۔ اسلام ایک ایسی عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے ۔ جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی گنجائش نہ ہوگی ۔

''اسلام دنیا میں مادی بنیادوں پر انسانیت کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے نہیں آیا ۔ بلکہ آراء اور افکار کی یک جہتی پر انسانیت کے قصر رفیع کو استوار کرنے کے لیے آیا تھا ۔''

(مسلمانان پنجاب کے نام ایک پیغام ، ۱۹۳۷ء)

''مسلمانوں کے لیے جائے پناہ صرف قرآن کریم ہے ۔ زمانے کے ساتھ ضرور چلنا چاہیے ۔ لیکن اپنے دامن کو اس کے بد اثرات سے آلودہ نہ ہونے دو ۔ میں اس گھر کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتا ہوں ۔ جس گھر سے علی الصبح تلاوت قرآن مجید کی آواز آئے ۔ کلام مجید کا صرف مطالعہ ہی نہ کیا کرو بلکہ اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو ۔'' (فروری ۱۹۳۸ء)

سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :

''اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیائے اسلام کو راہنمائی کی سخت ضرورت ہے ۔ سیاسی اعتبار سے تو ہم باقی اقوام اسلامیہ کو ایسی کوئی مدد نہیں دے سکتے ۔ البتہ دماغی اعتبار سے ان کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے ۔''

(اقبال نامہ)

میں حضرت علامہ کے اس ارشاد پر یہ مضمون ختم کرتا ہوں کہ انھوں نے تقریباً چالیس سال پہلے فرمایا تھا :

''اسلام اس وقت زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور اور شاید تاریخ اسلام میں اس سے پہلے ایسا وقت کبھی نہیں آیا ۔''

میرا خیال ہے کہ مسلمانان عالم کے اتحاد پر آج چالیس سال کے بعد بھی ویسا ہی سخت وقت ہے ۔ جیسا پہلے تھا ۔ خدا کرے کہ ہم اقبال کے نظریے سے استفادہ کرتے ہوئے اسلام اور شریعت محمدی ؐ پر متحد ہو سکیں ۔

(ہفتگی کراچی ، ۴ مارچ ۱۹۷۴ء)

اقبال کی توضیحات ۔
بندۂ مومن کے بارے میں

اقبال دو حیثیتوں سے دنیا سے روشناس ہوا ۔ ایک بحیثیت شاعر ، جس پر وہ فخر نہیں کرتا دوسرے بحیثیت مفکر اسلام جس پر اسے بجا طور پر ناز ہے ۔ جب ہم اسے مفکر اسلام کہتے ہیں تو صحیح طور پر اس سے ہمارا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اقبال کے فکر کو اسلام نے جلا دی ہے اور اس نے اسلام کے اصل منابع قرآن مجید اور احادیثِ نبوی ؐ سے استفادہ کیا ہے ۔ چنانچہ بندۂ مومن کی جو توضیحات وہ کرتا ہے ان کی بنیاد بھی انہی منابع پر ہے ۔ ان منابع میں سے صرف قرآن مجید پر نظر ڈالیں تو کم از کم سینکڑوں مقامات پر مومن کی تعریف پروردگار عالم نے خود فرمائی ہے ۔ صرف سورۃ ''المؤمنون'' کی ابتدائی آیات پر نظر ڈالیں تو ارشاد ربانی رہنمائی کرتا ہے کہ :

''مومنوں نے یقیناً فلاح پائی ہے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں ۔ لغویات سے دور رہتے ہیں ۔ جو زکوۃ (ادا) کیا کرتے ہیں ۔ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں'' ۔

مومنوں کے یہ صرف چند خصائص ہیں جن کا ذکر اس پر ہوا ہے ۔ اب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر نظر ڈالیں تو انھی خصائص کی توضیحات کے لیے آپ نے متعدد اسالیب پسند فرمائے ہیں ۔ مثلاً فرمایا :

''جو امانت کی صفت نہیں رکھتا وہ ایمان نہیں رکھتا اور جو دین کا پاس نہیں کرتا وہ دین نہیں رکھتا'' ۔
(بیہقی فی شعب ن) ۔

اور اب اجماع مشائخ پر نظر ڈالیں تو آداب ایمان کی توضیح ملتی ہے کہ ایمان تبھی تکمیل پاتا ہے جب زبان سے رسالت و رسالت کا اقرار کیا جائے ۔ دل سے ان کی تصدیق کی جائے اور ان کے ارکان پر عمل کیا جائے ۔ پھر یہ بھی کہا : جو آدمی زبان سے اقرار نہیں کرتا وہ کافر ہو جاتا ہے ۔ جو آدمی دل سے تصدیق نہیں کرتا وہ منافق ہے اور جو ترک اعمال کرتا ہے وہ فاسق ہے ۔ اور رسول ؐ کی متابعت نہ کرنے والا مبتدع ہے ۔ اس لیے بعض آدمی ایمان کے اعتبار سے دوسروں سے افضل تر ہوتے ہیں ۔

معروف تابعین میں سے ساتویں آٹھویں صدی عیسوی کے مشہور بزرگ حسن بصری رح (وفات ۱۱۰ ہجری) سے پوچھا گیا :

''کیا آپ صحیح مومن ہیں ؟ تو آپ نے جواب دیا : اگر اس ایمان سے مراد یہ ایمان ہے جو میرے خون اور مال کو معصوم رکھتا ہے اور میرے گشتہ اور نکاح کو حلال بناتا ہے تو میں صحیح مومن ہوں ۔ لیکن اگر تمھاری مراد اس ایمان سے ہے جس کی وجہ

سے بہشت تک میری رسائی ہوگی ۔ اور دوزخ سے نجات ملے گی اور خدائے رحمٰن مجھ سے مطمئن ہوگا ۔ تو پھر اگر خدا نے چاہا تو میں مومن قرار دیا جاؤں گا'' ۔

اسی دور سے تقریباً نصف صدی بعد کے ایک اور صالح بزرگ سفیان ثوری (وفات ۱۶۱ ہجری) نے اس رویے کی وضاحت یہ کی ہے کہ :

''ہم خدا ، رسولوں ، ملائکہ اور صحف سماوی پر ایمان تو لے آئے لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ خدا کے سامنے ہماری کیا حیثیت ہے'' ۔

یعنی مومن کا مرتبہ پا لینا کوئی آسان بات نہیں ۔ غالباً اسی جذبے نے اقبال سے کہلوایا تھا :

بندۂ مومن ز آیات خدا ست
ہر جہاں اندر بر او چون قباست

چوں کہن گردد جہانی در برش
می دہد قرآن جہانی دیگرش

(مومن خدا کی نشانیوں میں سے ایک ہے ۔ ہر دور اس کے جسم پر قبا کی مانند چست ہے اور جب ایک دور اس کے لیے پرانا ہو جاتا ہے تو قرآن اسے ایک نیا دور عطا کر دیتا ہے) ۔

یا یہ کہ :

مومنی بالای ہر بالا تری
غیرت او بر نتابد ہمسری

(مومن ہر بالا تر سے اونچا ہے ۔ اس کی غیرت کسی کو اپنے برابر تسلیم نہیں کرتی) ۔

گویا مومن اتنا اونچا انسان ہے کہ وہ ہر زمانے میں قرآن کی راہنمائی سے اپنے لیے ایک نیا جہان تخلیق کرتا ہے ۔ مومن کی اس علو ہمتی اور اس کے چلن کی وجہ سے اقبال اسے ''تقدیرِ الٰہی'' کے خطاب سے یاد کرتا ہے اور کافر یعنی ایمان نہ رکھنے والے آدمی پر اس کا تفوق ہر اعتبار سے ثابت کرتا ہے :

کافر ہے مسلماں ، تو شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

یہ مومن جو تقدیر الٰہی ہے اس کی صفات اقبال نے متعدد مقامات پر گنوائی ہیں ۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیے :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں ، کار کشا ، کار ساز

خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی ، اس کا دل بے نیاز

اس کی آمدیں قلیل ، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب ، اس کی نگہ دلنواز

نرم دم گفتگو ، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل و پاک باز

نقطۂ پرکار حق ، مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

مومن کی دنیاوی مساعی کو اقبال کس نظر سے دیکھتا ہے ۔ اس کو اس طرح بیان کیا ہے کہ :

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت ، نہ کشور کشائی

یا یہ مال و دولت دنیا ، یہ رشتہ و پیوند
بتان وہم و گماں ، لا الہ الا اللہ

مومن کی قدرت اور قاہری اگر مال و دولت دنیا نہیں تو کیا ہے :

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

خیر را او باز می داند ز شر
از نگاہش عالمی زیر و زبر

کوہسار از ضربت او ریز ریز
در گریبانش ہزاراں رستخیز

(مومن تو اپنے عزم اور توکل کی بدولت پہلوان ہے ۔ اگر اس میں یہ دو خوبیاں نہیں تو وہ کافر ہے ۔ وہ نیکی اور بدی میں خوب تمیز کرتا ہے اور اس کی ایک نظر سے دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ اس کی ضرب سے کوہسار

ریزہ ریزہ ہوتے ہیں اور اپنے گریباں میں ہزاروں قیامتیں لیے پھرتا ہے) ۔

یہ تو اس مومن کی بات تھی جو :

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشا کش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

اور

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

لیکن مومن نے جب ہاتھ سے ایمان کھو دیا تو اس پر کیا گزری ۔ یہ حقیقت بھی اقبال کی نظر سے اوجھل نہ تھی :

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری

اس صوفی نے مومن کے مرتبے سے نیچے اتر کر مسلمان کو تن بہ تقدیر آمادہ کیسے کیا وہ بھی سنیے :

اسی قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

اور اس تمام کے مومن نے جب اپنے زوال پر ناداری کا رونا عذر کے طور پر رویا تو اقبال کو کہنا پڑا :

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکارا ہوا
قلندری سے ہوا ہے ، تونگری سے نہیں

اور پھر اس زوال میں زوال پذیرفتہ مومن کی جو شکل بنی اس کی تصویر حضرت علامہ نے یوں کھینچی :

مومن و پیش کسان بستن نطاق !
مومن و غداری و فقر و نفاق !

با پشیزی دین و ملت را فروخت
ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت !

لا الہ اندر نمازش بود و نیست
ناز ہا اندر نیازش بود و نیست !

نور در صوم و صلوٰۃ آو نماند
جلوہ ای در کائنات آو نماند !

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ
فتنۂ او حب مال و ترس مرگ !

رفت از و آن مستی و ذوق و سرور
دین او اندر کتاب و او بگور !

تا جہاد و حج نماند از واجبات
رفت جان از پیکر صوم و صلوٰت !

روح چون رفت از صلوٰت و از صیام
فرد ناہموار و ملت بی نظام !

سینہ ہا از گرمی قرآن تہی
از چنین مردان چہ امید بہی !

(یہ کیا مومن ہے جو دوسرے انسانوں کے سامنے پیٹی باندھ کر کھڑا ہوتا ہے! یہ کیا مومن ہے جو غداری، غربت اور نفاق میں مبتلا ہے۔ یہ وہ مومن ہے جس نے دین اور ملت کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیا۔ اس طرح اپنے گھر کا سامان اور خود گھر جلا دیا۔ اس کی نماز میں لا الہ تھا جو نہیں رہا۔ اس کے عجز میں فخر تھا جو نہیں رہا۔ اس کے نماز روزے سے نور چھن گیا اور اس کی پونجی میں کوئی جلوہ نہ رہا۔ یہ وہ (مومن) تھا جس کا ساز و سامان صرف اللہ تھا۔ لیکن یہ مال کی حرص اور موت کے خوف سے برباد ہوگیا۔ (نتیجتاً) اس سے (زندگی کا) نشہ، ذوق اور سرور چھن گیا۔ اس کا اسلام قرآن کے اندر اور وہ خود قبر میں بند ہوگیا)۔

اس نے جب جہاد اور حج کے فرائض ترک کر دیے تو اس کے نماز روزے کے جسم سے جان نکل گئی پھر وہ آکھڑا آکھڑا فرد بن گیا جس کی ملت بے نظام تھی۔ اس کا سینہ قرآن کی حرارت سے خالی ہوگیا۔ ایسے لوگوں سے فلاح و بہبود کی کیا توقع کر سکتے ہو؟

مومن است و پیشہ او آذری ست
دین و عرفانش سراپا کافری ست

(مومن تو ہے لیکن پیشہ اس کا بت پرستی ہے اور اس کا دین و عرفان سر تا سر کفر ہے)۔

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری

وجود انھی کا طواف بتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

ایسا مومن جس نے صرف علائق دنیا سے دل بستگی پیدا کر لی ہے - اقبال اس سے براہ راست سوال کرتا ہے :

بتوں سے تجھ کو امیدیں ، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے ؟

مومن اور کافر کے خصائص کی بحث اقبال کے تمام کلام میں ایک رو کی طرح جاری و ساری ہے - وہ مومن کی تعریف کرتا ہے اس کے زوال کے وجوہ بیان کرتا ہے - اور اس کے نتائج کی توضیح کرتا ہے - مختصر طور پر :

بسوزد مومن از سوز و جودش
کشود ہر چہ بستند از کشودش

جلال کبریائی در قیامش
جمال بندگی اندر سجودش

(مومن اپنے وجود کے سوز سے دہکتا رہتا ہے - اس کی آزادی سے ہر پابند کو آزادی نصیب ہوتی ہے - اس کے قیام میں جلال کبریا ہے اور اس کے سجدے سے خدا کی اطاعت کا نور نمایاں ہے) -

یعنی وہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو جلال الٰہی کا مظہر ہوتا ہے اور سجدے میں گرتا ہے تو اطاعت خدا کے انوار سے کائنات کو منور کرتا ہے -

لیکن اگر توحید و رسالت کے انوار سے خود اس کا کردار منور نہ ہو تو پھر یہ خود بھی چاہ ظلمات کردار سے باہر نہیں نکل سکتا اور یہی اس کی زوال پذیری کی علامت

اور وجہ ہے :

روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

اور اس زوال سے مومن جس بربادی تک پہنچتا ہے اور اس سے جو صورت حالات پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے :

من و تو از دل و دین نا امیدیم
چو بوئے گل ز اصل خود رمیدیم
دل ما مرد و دین از مردنش مرد
دو تا مرگی بیک سودا خریدیم

(میں اور تو (ہم دونوں) اپنے دل اور دین سے نا امید ہو چکے ہیں اور گلاب کی خوشبو کی طرح اپنے منبع سے الگ ہوگئے ہیں - ہمارا دل فوت ہوا تو اس کے ساتھ ہی ہمارا دین بھی مر گیا - (اور ہم کتنے احمق ہیں کہ) ایک بیوپار سے ہم نے دو موتیں خرید لیں) -

سوچنے والی بات یہ ہے کہ اقبالؒ نے جو باتیں آج سے نصف صدی پہلے کہی تھیں اور قرآن مجید نے مومن کی جو تعریف کی ہے ، اور نا مومن رہنے سے جو نقصان ملت اسلامیہ پاکستان کو پہنچتے ہیں - کیا ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم قرآن مجید ، احادیث نبویؐ اور کلام اقبال کو پہلو بہ پہلو رکھ کر اور سمجھ سوچ کر اپنے آپ کو مومن کی صفات سے متصف کرنے کی کوشش کریں تا کہ ہم فلاح دارین سے مستفید ہو سکیں ؟ صرف زبانی سطح پر تقریریں کرنے کرانے مقالات پڑھنے سننے اور ان سے چٹخارے لینے سے تو کام نہیں چلے گا - ملت اسلامیہ پاکستان کا معاشرہ آج ہر اس پراگندگی

کا شکار ہے جس کی وجہ نا مومن اشخاص کے افعال ہوتے ہیں۔ ہمارے باہمی معاملات، لین دین، تعلیم و تربیت، کار و بار، اور سیاست یہاں تک کہ نظام مملکت داری سب کچھ نامومن کے مہیب سایوں سے تاریک ہو رہا ہے۔ معاشرتی زندگی انوار الٰہی سے محروم ہوتی جا رہی ہے اور ہم اس صورت حالات کو حیرت سے تک رہے ہیں۔ اس سمے کچھ لوگ اسلام سے دور کئی قسم کے ازموں کے دل کش نعرے لگاتے ہوئے بار بار آگے بڑھتے ہیں اور ان کی چکا چوند سے ہماری آنکھوں کو خیرہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ظلمت کردار ہے کہ وسیع اور عمیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ ازم نہ ایمان کا راستہ دکھاتے ہیں اور نہ مومن بننے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ پھر اصلاح احوال کیسے ہو؟ پروردگار عالم کا وہ وعدہ ابھی تک بحال اور قائم ہے۔

''اگر تم مومن ہو تو غالب رہو گے''۔

(آل عمران، ۲۳۹)

ہم اس وعدہ کو پورا کرانے کی شرائط پوری نہیں کر رہے اور کامیابی ہم سے دور ہے۔ اقبال کو پڑھنے اور سننے کا ایک فائدہ تو اٹھائیے کہ مومن بن کر غالب بن کر رہیے۔

(نوائے وقت، لاہور، ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء)

اقبال سے دور کی ہم عصری کا شرف

اقبالؒ سے ہم عصری کا ذکر آئے تو معاً ذہن میں یہ بات ابھرتی ہے - جیسے میرے جیسا ایک تہی دامن پست قد فقیر ہمالیہ کی کسی نشیبی وادی میں بے بضاعتیوں کو سینے سے لگائے ایسے برجستہ غنی کو دیکھ رہا ہے - جو چوٹی پر کھڑا ہوا کائنات کی پہنائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے احکامات الٰہی اور ارشادات رسولؐ کی تفسیریں بکھیر رہا ہے - اقبال سے ہم عصری کے باوجود اقبال سے رشتۂ قربت فقط یہی تھا - کہنا یہ مقصود ہے کہ اقبال تک رسائی ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کی عظمت و بینش کے لامتناہی نور کے سامنے اپنی بے دانستی کا چراغ بے حد دھیما دھیما جلتا تھا اور دونوں میں اس قسم کی موانست نہ تھی جسے ہم جلیسی، مصاحبت یا دوستی کا درجہ دیا جا سکے -

اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اقبال کی سگی بہن کرم بی بی میری تائی تھیں - اور وہی اقبال تک رسائی کا زینہ اس وقت بنیں جب میں نے شعور کی آنکھ سے نہیں بلکہ اقبال کی شہرت سے اسے پہچاننے کا تجسس پیدا کیا - تائی کرم بی بی کبھی کبھی اقبال کے پاس آ کر ٹھہرتی تھیں اور ان دنوں ہم چائے کی پیالی اندرون سے لا کر اس کوہ وقار شخصیت کو پیش کر دیتے تھے - اور باقی کا وقت حیرت سے اس کی طرف تکتے رہتے تھے - ہم میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو

تعارف اس سے آگے بڑھتا ۔ اقبال ایم ۔ اے ۔ میں میرے ممتحن بھی تھے ۔ وہ فارسی کا تیسرا پرچہ بنایا کرتے تھے ، یہ پرچے اب تک میرے پاس محفوظ ہیں ۔ اور آج میں اس واقعہ پر غور کرتا ہوں تو ایک فخر سا محسوس کرتا ہوں کہ میرے اس پرچے کو اقبال نے جانچا تھا اور مجھے موفقیت کی سند دی تھی ۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ۔ ہم عصری کے فخر کے سوا اور کوئی بات نہ تھی جو ہمارے روابط کی مزید تحکیم کرتی ۔ سلامت اللہ شاہ نے بال جبریل کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں شائع کیا ۔ شاہ صاحب مرحوم لاہور کے سب سے بڑے کتب فروش تھے اور یونائٹڈ آکشن مارٹ کے نام سے میکلوڈ روڈ پر ایک وسیع و عریض کوٹھی میں اپنا کاروبار کرتے تھے ۔ اُن کی دوست پروری ، نیک نیتی اور صاف دلی کا ملک بھر میں شہرہ تھا ۔ طبعاً درویش منش تھے ۔ ہماری بھی اُن سے یاد اللہ تھی ۔ بال جبریل کے چھپنے کی دھوم مچی ہوئی تھی ۔ ہم نے شاہ صاحب سے عرض کر رکھا تھا کہ کتاب تیار ہو تو سب سے پہلا نسخہ ہمیں مرحمت فرمایا جائے ۔ شاہ صاحب نے یہ درخواست منظور فرمائی ، اور کتاب شائع ہوئی تو ہم پہلا نسخہ خرید کر سیدھے اقبال کے حضور پہنچے ۔ اُس وقت اُن کا مکان اسی سڑک پر چند قدم کے فاصلے پر تھا ۔ میں نے کتاب پیش کی ، اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک ہلکی سی ہونہہ کے ساتھ فرمایا :

چھپ گئی ہے ؟

میں خاموش کھڑا کچھ عرض کرنے کے لیے حوصلہ جمع

کر رہا تھا ۔ اتنے میں انھوں نے کتاب ایک طرف رکھ دی ۔ اب میں نے بے قرار ہو کر کہا :

''اس پر دستخط فرما دیں ۔ یہ اولین جلد ہے جو خریدی گئی ہے''۔ اس عظیم انسان کی عظمت ہر وقت اس پر عیاں تھی ۔ ہم جسارت کر بیٹھے تھے ۔ فوراً کہا :

''اس طرح تو مجھے بہت سی کتابوں پر امضا کرنے پڑیں گے''۔ بے بضاعتی عظمت کے رو در رو ہو کر شکست فاش کھا گئی تھی ۔ میں حسب معمول کچھ دیر بیٹھا رہا ، پھر بال جبریل اٹھا کر چلا آیا اور سرورق پر یہ بات لکھ دی ۔ اس اعتبار سے یہ کتاب آج بھی میرے کتب خانے کی عزیز ترین متاع ہے ۔

کوئٹے کا ۱۹۳۵ء کا زلزلہ آ چکا تھا ۔ ایک خوب صورت شہر دم زدن میں ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا ۔ بیان کرنے والے کہتے ہیں ۔ زمین پھٹتی تھی اور شاہراؤں کی شاہراہیں اور ان پر چلتے ہوئے انسان اور جانور پک دم نیچے چلے جاتے تھے اور پھر اوپر سے زمین اپنا لقمہ نگل کر بند ہو جاتی تھی ۔ جاوید اور منیرہ کی والدہ اسی دوران میں فوت ہوئی تھیں ۔ علامہ اقبال اپنی عزیز ہمسر کے خدا کو پیارے ہو جانے سے بے حد آزردہ رہتے تھے اور بیشتر وقت ان کے آنسو جاری رہتے تھے ۔

مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹ سے تعزیت کے لیے تشریف لائے ۔ مولانا اقبال سے عمر میں بڑے تھے ۔ ہم وطن تھے اور برسوں سے روابط مودت قائم تھے ۔ فاتحہ ختم ہوا تو اقبال آنسوؤں میں تحلیل ہو کر رہ گئے ۔ مولانا نے دل داری کی تو اقبال نے کہا :

مولانا میں اپنے متعلق مشوش نہیں ۔ مجھے تو ہر وقت ان دو بچوں کا خیال رہتا ہے ۔ (جاوید اور منیرہ وہیں گھوم رہے تھے) ان کی دیکھ بھال کون کرے گا ؟ ان کے خورد و نوش کا انتظام کون کرے گا ؟ انھیں بستر میں کون سلائے گا ؟ اور پھر جیسے آنسوؤں کا سیلاب سارے بند توڑ کر بہہ نکلا ۔

مولانا کچھ دیر خاموش رہے اور پھر انھوں فرمایا :
ڈاکٹر صاحب ! آپ نے اُن بچوں کے متعلق کچھ سنا

جو کوئٹے سے مختلف شہروں میں لائے جا رہے ہیں ۔ یہ کوئٹے کے زلزلے کا شکار ہیں اور ان میں سے کچھ اتنے چھوٹے ہیں کہ نہ اپنا نام بتا سکتے ہیں اور نہ اپنے ماں باپ کا ۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شناخت ہی نہیں ہو سکتی کہ یہ کس کے بچے ہیں ؟

علامہ اقبال جبلی طور پر بڑے نرم دل کے انسان تھے ۔ انھوں نے زلزلے کی ان ہول ناک تفصیلات کو دل چسپی سے سننا شروع کیا اور دفعتاً ان کے آنسو رک گئے ۔

مولانا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا :

سیالکوٹ میں بھی چند ستم دیدہ بچے پہنچے ہیں ۔ ہم جب دریوں پر بٹھا کر ان بچوں کو کھانا کھلانے لگتے ہیں تو ایک بچہ کھانا کھانے سے انکار کر دیتا ہے اور شور مچاتا ہے ۔

"آپا ! میرا چمچہ کانٹا لاؤ ۔ میں اپنے نیکن کے بغیر کھانا نہیں کھاؤں گا" ۔

دیکھنے والے اس منظر کو دیکھ کر آنسو بہانے لگتے ہیں ۔ بچہ اصرار کے باوجود کھانا کھانے سے انکار کر دیتا ہے نہ اپنا نام بتا سکتا ہے ، نہ کسی کو معلوم ہے یہ کس کا بچہ ہے ۔

اقبال چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے ۔ اٹھ کر سیدھے بیٹھ گئے اور کہنے لگے :

اچھا !

مولانا نے کہا :

اگلے دن بچے کو زبردستی کھانا کھلایا گیا ۔ ورنہ پہلے دن وہ چیختا چنگھاڑتا بھوکا ہی سو گیا ۔ اقبال سوچو تم ابھی سلامت موجود ہو ۔ اگر ان بچوں کی ماں فوت ہو گئی ہے تو کیا ۔ ان کا بہت بڑا سہارا باقی ہے ۔

اقبال کی آنکھیں نہ صرف خشک تھیں بلکہ حوصلہ مندی سے چمک رہی تھیں ۔ وہ اب ایک مختلف انسان نظر آ رہے تھے ۔ قریب بیٹھے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ایک وسیع اور عالمگیر غم کے مقابلے میں اقبال اپنے غم کو حقیر سمجھنے لگے تھے ۔ مولانا نے بات ختم کی تو اقبال نے کہا :

ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان خوف و حزن سے پاک رہے ۔ میں اس وقت یہ بھول چکا تھا ۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس ابدی حقیقت کی طرف میری توجہ دلائی ۔

اس واقعے کے بعد علامہ نے مرحوم اہلیہ کی وفات کا تذکرہ بند کر دیا ۔ بلکہ بعد کے ایام میں وہ کئی دن تک یتیم ہونے والے بچوں کا واقعہ لوگوں کو سناتے رہے ۔

ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ و فکر پر بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن اُن کی انسان دوستی اور عظمت وقار سے محبت کے متعلق ابھی تک کافی مواد فراہم نہیں کیا گیا۔ وہ ایک درد مند انسان تھے۔ جنھوں نے آدمیت کے اس عظیم اصول کو ساری عمر اپنائے رکھا کہ آدمی کا احترام کرنا ایک بہت بڑا انسانی وصف ہے۔

اقبال کے نسبتاً قریب کے معاصرین اور اُن سے بہت قریب مرزا جلال الدین نے ایک یوم اقبال کی تقریب پر فرمایا۔ ایک دن اقبال کو میرٹھ سے ایک خط ملا۔ جو ایک نوجوان دوشیزہ نے لکھا تھا، اُس میں درج تھا۔ میں منشی فاضل ہوں اور قبول صورت بھی ہوں۔ اس اعتبار سے میں آپ کی زوجہ بننے کی آرزو مند ہوں۔ میرا خیال ہے ہماری زندگی بڑی کامیاب رہے گی۔ علامہ نے یہ خط مرزا صاحب کو دکھایا اور پھر یہ کہہ کر پھینک دیا۔ غالباً کسی مزاح نگار نے یہ حرکت کی ہے۔ لیکن معاملہ اس طرح ختم نہ ہوا۔ مرزا صاحب اور اقبال اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ (اُن دنوں علامہ صاحب کا دفتر بھی انارکلی بازار میں تھا)۔ کہ ایک خاتون برقعہ پہنے ہوئے تشریف لے آئیں۔

استفسار پر معلوم ہوا کہ یہ وہی خاتون ہیں جنھوں نے میرٹھ سے خط لکھا تھا۔ چونکہ اقبال اس خط کے جواب میں خاموش رہے اس لیے انھوں نے اسے رضا مندی پر محمول کیا اور خود لاہور تشریف لے آئیں۔ مرزا صاحب کا بیان ہے کہ اس صورت حال سے اقبال بہت پریشان تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں خاتون سے بے حد ہمدردی تھی۔ انھوں نے اسے ایک دوسرے کمرے میں بٹھایا اور مرزا صاحب کی

وساطت سے ایاب و وہاب کے تمام اخراجات ادا کیے اور مرزا صاحب کے ذمے لگایا کہ آپ اس خاتون کو میرٹھ کی گاڑی میں سوار کرائے خود جائیں۔ مرزا صاحب کا بیان ہے کہ رخصت ہوتے وقت اس خاتون نے کہا میں نے خط میں ایک آرزو کی بات کی ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اقبال مجھے بقیہ عمر ایک خادم کی حیثیت سے اپنے گھر میں رکھ لیں۔ میرے لیے اس عظیم شخصیت کی خدمت میں عمر بتا دینا ایک بہت بڑا فخر ہوگا۔ لیکن اقبال کا خیال تھا ایسا کرنا احترام آدمیت کی خلاف ورزی کرنا ہے۔ اور انھوں نے نہایت ہی خلوص انداز میں معذرت کرتے ہوئے اس خاتون کو با وقار طریقے سے رخصت کر دیا۔

(نوائے وقت، لاہور، یکم ستمبر ۱۹۷۷ء)

———

تنظیم اصول مملکت داری۔
اقبال کے نظریات

اقبال نے مملکت داری کے اصول پر جن خطوط پر سوچنا شروع کیا تھا ۔ وہ مختصر طور پر یہ تھے کہ مسلمانوں کی مملکت میں ایسا نظام حیات جاری کیا جائے گا جو خیرالقرون کی یاد تازہ کر دے گا ۔ یہاں اوامر و نواہی کی پابندی ہوگی اور اسلامی نقطۂ نظر سے معاشی اور معاشرتی عدل و انصاف رائج ہوگا ۔ انھوں نے جس دور میں ایسی مملکت کے متعلق تصور قائم کیا تھا ۔ وہ واضح طور پر ترانۂ ہندی کی اس طرز فکر سے ہٹ چکے تھے :

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

یا یہ کہ :

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اسی لیے ایک گفتگو میں حضرت علامہ نے علانیہ کہا :

''میں سماجی اتحاد کے لیے وطن کو ایک بنیاد سمجھتا تھا ۔ اس لیے خاک وطن کا ہر ذرہ مجھے دیوتا دکھائی دیتا تھا ۔ اس وقت میرے خیالات مادیت کی طرف مائل تھے ۔ سوائے وطن کے مجھے انسانوں میں اتحاد کے لیے

کوئی دوسرا ذریعہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب میں انسانوں کو صرف ازلی اور ابدی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتا ہوں اور جب بھی میں اسلام کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد اس سے یہی روحانی نظام ہے :

ملت از آئین حق گیرد نظام
از نظام محکمی خیزد دوام

ہست دینِ مصطفٰی دینِ حیات
شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات

اس کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اقبال اجتماعی جمہوریت (social democracy) کے بھی قائل رہے۔ وہ یہ معین نہ کر سکے کہ اس جمہوریت کے خدو خال کیا ہوں گے۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے قائداعظمؒ کو ایک خط میں لکھا :

'Social democray in some suitable form and consistent with the legal principles of Islam is not a revolution but a return to the original purity of Islam.

''اجتماعی جمہوریت کسی موزوں شکل اور اسلام کے فقہی اصولوں کے مطابق انقلاب نہیں ہوگا بلکہ یہ اسلام کی اصلی پاکیزگی کی طرف مراجعت ہوگی۔''

یہ بھی صحیح ہے کہ اقبالؒ نے اپنی کتاب اسلام میں تجدید نظریات اسلامی میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلامی قانون حرکی ہے۔ انھوں نے اسلام کی قوت جاذبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام کی یہ حرکی خاصیت سب سے زیادہ اس کے قانون میں موجود ہے۔ انھوں نے فرمایا :

کہ قرآن قانون کی کتاب نہیں، گو قانون کے چند بنیادی اصول اس میں پیش کیے گئے ہیں ۔ انھوں نے لکھا کہ اجماع اسلامی آئین کا اہم ترین حصہ ہے اور دور حاضر میں اجماع کا وظیفہ مجلس مقننہ ہی ادا کر سکتی ہے ۔

لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ علامہؒ نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ اجتہاد اور اجماع کے فرائض اس مقننہ یا ان آدمیوں کے سپرد کیے جا سکتے ہیں ، جو قرآن و سنت سے نابلد ہوں ۔ ظاہر ہے کہ کسی مسئلہ کا عملی حل اور اس پر غور صرف انھی علماء کے سپرد کیا جا سکتا ہے ، جو اسلامی حدود میں رہ کر اس کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کر سکیں ۔

رائج فرنگی طرز کی جمہوریت یا مقننہ کے متعلق اقبال کی رائے یہ تھی :

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اقبال نے یہ وضاحت بھی کی تھی کہ جمہوریت دراصل آمریت کا ایک روپ ہے ۔ از منہ مناقبل میں بادشاہ تنہا آمر کا رول ادا کرتے تھے ۔ اب بہت سے لوگ مل کر جمہوریت کے نام پر اقتدار حاصل کرکے حاکم ، گورنر ، وزیر اور مقننہ کے اراکین بن جاتے ہیں اور ایک گروہ کی شکل میں عوام کا استحصال بعینہ اس طرح کرتے ہیں ، جیسے بادشاہ یا آمر ماضی میں کرتے تھے :

یہ ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

سوشلزم کے متعلق بھی اقبال کا حرف آخر یہ تھا کہ اشتراکیت سب پیٹوں کو مساوی غذا دینے کا وعدہ اور سعی کرتی ہے ، لیکن اس تحریک کا قلب مومن ہو تو ہو ، دماغ صرف کافر ہے ۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پیٹ بھرنے سے جان پاک ہاتھ نہیں آتی کیونکہ صرف تن پروری سے روح کی بالیدگی حاصل نہیں ہوتی :

صاحب سرمایہ از نسل خلیل
(یعنی کارل مارکس)

یعنی آن پیغمبر بی جبرئیل

زانکہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

غربیان گم کردہ اند افلاک را
در شکم جویند جان پاک را

رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک
جز بتن کاری ندارد اشتراک

اقبال نے آمریت یعنی ڈکٹیٹر شپ کے متعلق بھی اپنے خیالات چھپا کر نہیں رکھے ۔ آمریت کی صحیح شکل اقبال کے سامنے تھی کہ آمر جب مسند اقتدار پر متمکن ہو جاتا ہے تو اپنے اردگرد آرڈیننسوں سے حصار بناتا ہے اور پھر اپنی سطوت و قوت کے ساتھ چڑیوں اور مولوں کے دل اور ذہن والے مشیر

چن کر حکومت کرنے لگتا ہے :

قاہر آں کہ باشد پختہ کار
از قوانین گرد خود بندد حصار

جرہ شاہین تیز چنگ و زور گیر
صعوہ را در کارہا گیرد مشیر

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اقبال کسی طرز کے مروجہ نظام حکومت کو پسند نہیں کرتا تو آخر آس کے ذہن میں ایسا کون سا نظام تھا جو آسے قابل قبول تھا ۔ اقبال کی تحریروں میں ہمیں اس کا شافی جواب ملتا ہے ۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اقبال مملکت داری اور دین میں علیحدگی کا قائل نہیں ۔ آس کے عقیدے کے مطابق مملکت داری کو دین سے جدا کرنے سے ایک اس قسم کا فساد معاشرے میں پیدا ہوتا ہے ۔ جس کا کوئی حل نہیں :

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

دوئی ملک و دین کے لیے نامرادی
دوئی جسم تہذیب کی نابصیری

دوسری بات یہ ہے کہ اقبال احکام خداوندی کو واضح، اٹل ، لازوال ، ہر عہد کے لیے موزوں اور زندگی کے بنیادی اصول سمجھتا ہے ۔ وہ بارہا اعلان کرتا ہے کہ مغربی تصورات حیات اور ان پر مبنی اصطلاحات ژولیدہ خیالی کا باعث ہیں اور اوامر و نواہی کو ووٹوں سے منظور یا رد نہیں کیا جا سکتا ۔ نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل صرف صائب الراء علماء

کر سکتے ہیں ، ووٹ نہیں ۔ علامہ اقبال نے یہ تو کہا تھا ۔ کہ اجتہاد و اجماع کے لیے شوریٰ کی جگہ مقننہ لے سکتی ہے ۔ لیکن انھوں نے یہ کبھی نہیں کہا ۔ کہ قرآن و سنت سے نابلد مقننہ اجتہاد و اجماع کے فرائض ادا کر سکتی ہے ۔ مختصر طور پر اقبال اس دنیا میں بلکہ کائنات پر صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلق کا قائل اور مبلغ تھا ۔ اسلام اور فرنگی طرز کی جمہوریت میں پیوستگی ختم کر دینا چاہتا تھا ۔ اطاعت امیر اور شوریٰ کی ترویج کا حامی تھا ۔ ووٹ بازی سے متنفر تھا ۔

اقبال کی یہ گائڈ لائنز آج بھی اسلامی نظام حکومت آستوار کرنے میں مشعلِ راہ بن سکتی ہیں :

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہیے

مسلمانے کہ داند رمزِ دین را
نساید پیشِ غیر اللہ جبین را
اگر گردون بہ کامِ او نہ گردد
بکامِ خود بہ گرداند زمین را [1]

The Muslim who understands the secrets of religion,

Dose not rub his forehead before anybody except God.

If destiny (heaven) does not work according to his will,

He makes the destiny (earth) work according to his will.

Bibliography

۱ - "روزگارِ فقیر" (جلد دوم) فقیر سید وحیدالدین ، کراچی ۱۹۶۵ء -

2. Kaul, Pandit Harikishan, *Census of India*, 1911, *Punjab Report*, part I. Lahore, 1912.

3. Iqbal, Sir Mohammad, *The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam*. Lahore, 1954.

4. Sherwani, Latif Ahmed, *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*. Lahore, 1977.

5. *The Hindustan Review*, Allahabad, July & August, 1909.

6. Galwash, Ahmed A., *The Religion of Islam*, ii. Cairo, 1961.

1. *Ibid.*, 1024.

The Godly man is a free person and that is all,

His country and its constitution are God given.

He is just in peace and war,

His friendship and enmity are based on the principle that he does not show undue favour to anybody nor is afraid of anyone.

سرِ دین صدق مقال ، اکلِ حلال
خلوت و جلوت تماشائے جمال !
در رہِ دین سخت چون الماس زی
دل بحق بر بند و بے وسواس زی[1]

The secret of religion lies in uttering truth and eating permissibles,

And concentrating on God in privacy and in company.

In the way of religion he is firm with the hardness of a diamond,

Fasten your heart on God and live with conviction.

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی ![2]

To respect human is humanity,
Know the place of humans.

1. *Kulliyat-e-Iqbal*, 792.
2. *Ibid.*, 793.

all to guard yourselves against all sorts of injustice."[1]

Again Muslim ethics and moralities as stated in the Holy Quran embrace the consideration of all those moral excellences known to any advanced civilization, such as sincerity, honesty, humility, justice, patience, straightforwardness, keeping a promise, chastity, meekness, politeness, forgiveness, goodness, courage, veracity, sympathy and other moral rules of conduct and Iqbal has preached all this, drawing largely from the Holy Quran and teachings of Holy Prophet although he has not discussed the issue in a consolidated manner in any one of his discourses or poems.

The following selections will help in elucidating his point of view :

حکومت الٰہی

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نی غلام او را نہ او کس را غلام
بندۂ حق مرد آزاد است و بس
ملک و آئینش خداداد است و بس
عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف
وصل و فصلش لایراعی لایخاف[2]

'The Godly man does not bother about worldly status,
He possesses no slave and he is not slave to anybody.

1. Tr. by Ahmad A. Galwash in '*The Religion of Islam* ii, 117.
2. *Kulliyat-e-Iqbal*, 659.

According to Iqbal 'a strong will in a strong body' is the ethical ideal of Islam. Expounding his theory in an article published in the *Hindustan Review* in 1909, he worte :

> 'Man is a free responsible being; he is maker of his destiny, his salvation is his own business. There is no mediator between God and Man. God is the birth-right of every man. The Quran therefore, while it looks upon Jesus Christ as the spirit of God, strongly protests against the Christain doctrine of Redemption, as well as the doctrine of an infallible visible head of the Church –doctrines which proceed upon the assumption of the insufficiency of human personality and tend to create in man a sense of dependence, which is regarded by Islam as a force obstructing the ethical progress of man.'[1]

The moral basis on which Muslim society is built up may be traced back to the last address delivered by the Holy Prophet (May peace be upon him) soon after his farewell pilgrimage, in which he said :

> 'Let it be well understood that your lives and property are sacred and inviolable to each other. Every one will have the share of inheritance. The child belongs to his parents. You have rights over your wives and they have rights over you . . . . Do not transgress and be faithful to any trust placed in you. Usury is prohibited and also vengeance for blood... . I ask you

1. Iqbal. M. *Islam as a Moral and Political Ideal* published in the *Hindustan Review*, July 1909, pp. 29-38 and August, pp. 166-71.

'By nature this (human being) of clay is neither angelic nor devlish. (His) deeds actually constitute the Heaven and Hell of (his) life.

He clarifies :

'The Quran is a book which emphasises 'deed' rather than 'idea'.'[1]

Islam as a *Moral Ideal* was discussed by the Allama as early as 1909, when he said :

'The highest virtue from the standpoint of Islam is righteousness, which is defined by the Quran in the following manner :

It is not reighteousness that ye turn your faces in prayers towards east and west, but righteousness is of him who believeth in God and the last day and the angels and the Prophets, who give the money for God's sake unto his kindred and unto orphans and the needy and to strangers and to those who ask and for the redemption of captives; of those who are constant at prayers, and of those who perform their covenant when they have covenanted and behave themselves patiently in adversity and in times of violence.

'It is therefore evident, that Islam so to speak, transmutes the moral values of the ancient world, and declares the preservation, intensification of human personality, to the ultimate ground of all ethical activity'.[2]

1. Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam, Preface.*

2. Sherwani, Latif Ahmad, *Speeches*, 93.

'We must not forget' says Iqbal, 'that what is called science is not a single systematic view of reality, it is a mass of sectional view of reality — fragments of total experience which do not seem to fit together . . . thus religion which demands the whole of reality and for this reason occupies a central place in any synthesis of all the data of human experience has not reason to be afraid of any sectional view of reality.[1]'

Thus treating this whole of reality within the domain of religion and talking about the legends and history mentioned in the Holy Quran, Iqbal says :

'The object of the Quran in dealing with these legends is seldom historical; it nearly always aims at giving them a *universal moral* (italics are mine) or philosophical import.'

In other words Iqbal admits that the basis for morality is the Holy Quran.'

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

'If you want to live as a Muslim, you can't do it without following the Quran'.

This standard of life is confined to Muslims. But generalising it for the whole humanity, he also asserts :

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

1. Iqbal, Sir Mohammad '*The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam*'. 185.

and have our being. To us it is above every thing else, as England is above all to the Englishmen and 'Deutsche' and 'uber alles' to the German[1].

This and many other declarations of the same pattern made by Iqbal on numerous occasions show in what high esteem he held the religion of Islam. But what was his concept of religion ? 'Religion' says Iqbal, which is essentially a mode of living is the only serious way of handling Reality[2].

He explains :

'Religion holds out the prospect of nothing less than a direct vision of reality. Science grasps reality in piecemeal. Religion grasps it in its wholeness. One fixes its gaze on the eternal and the other on the temporal aspects of reality[3].

He adds :

'The truth is that the religious and scientific processes, though involving different methods, are indentical in their final aim. Both aim at reaching the most real, in fact, religion is far more anxious to reach the ultimately real than science.[4]

1. Pandit Harikishan Kaul, *Census of India*, 1911, *Punjab Report* part I, page 162-4, and Sherwani, Latif Ahmad, *Speeches writings and statements of Iqbal*, 105.
2. Iqbal, Sir Mohammad, *The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam*, 114.
3. *Ibid.*, 2.
4. Iqbal, Sir Mohammad '*The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam*', 185.

Iqbal on the Concept of Religion and Morality

Islam was the religion of Iqbal. While he never referred to any religion in an uncomplimentary manner, yet he fervently believed in Islam and drew upon it for his inspirations, including morality. At least he twice mentioned unequivocally about his religious beliefs saying :

''میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں ۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملوں میں غیر مقلد ہوں ۔ عملی اعتبار سے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مقلد ہوں ۔

In religious beliefs I follow ancestors. Ideologically in religion and jurisprudence I am. غیر مقلد. In practice I follow Iman Abu Hanifa.[1]

In an article on *Islam as a Moral and Political Ideal*, by Dr. Sheikh Mohammad Iqbal, published in the *Hindustan Review* and reproduced by Pandit Harikishan Kaul in the *Census of India*, 1911, *Punjab Report*, an effort was made to bring out the point that :

'The idea of Islam is, so to speak our eternal home or country wherein we live, move,

1. Will of Iqbal quoted in Faqir Sayyid Vahidud Din's *Ruzgare-e-Faqir*, 59.

said "The unity of my Ummat is the final argument." (The Inqilab, June 5, 1931).

July 3, 1931 : Maulavi Daud Ghaznavi presided at a public meeting in Mochi Gate gardens to press for the above mentioned Inquiry Commission. Iqbal again addressed this meeting and pressed for the demends of Muslims (The Inqilab, July 5, 1931).

Islamic History

June 11, 1932 : The Muslim Institute, Lahore arranged a public meeting in Mochi Gate gardens to protest against the decision of the Punjab University to discontinue the subject of Islamic History from the B.A. Syllabus. Allama Iqbal presided at this meeting and remarked : When I visited Italy I met Prince Caetani. He is a great admirer of Islamic History. He has written so many books on Islamic History and has spent so much money that no Muslim State can even afford to get all this translated. He has spent millions to collect historical material. When I asked him as to wny he was interested in Islamic History he replied. "The study of Islamic History metamorphoses women into men".

Probably this was the last time when Iqbal appeared in public and in Mochi Gate gardens.

———

address of the 30th January. (Preserved in the Zamindar, Feb. 2. 1927).

December 30, 1927 : Speaking at a public meeting held in Mochi Gate gardens, under the presidentship of Maulavi Fazl Din, Iqbal said : "At the moment Muslims are facing two problems ; first the attainment of complete independence and second the communal representation. As Muslims have lost hope of independence, due to the disappointing attitude of the majority in the country, they are now concentrating on safeguarding their national rights. And the progress of Indian Muslims entirely depends upon it." (The Inqilab, January 1, 1928).

May 2, 1931 : Dr. Iqbal presided at a public meeting held in Mochi Gate gardens. In his lengthy address he supported separate electorate for the Muslims and said : Let us find out in the first instance what is meant by nationalism. The experiment of nationalism in Europe has ended in irreligiousness —You are all Muslims and this is your correct identification. (The Inqilab, May 15, 1931.)

May 13, 1931 : Allama Iqbal presided at a meeting held in Mochi Gate gardens to demand the establishment of an Inquiry Commission against Mr. Whittaker, the Principal of Maclagan Engineering College, as the Principal had maltreated the Muslim students and had forced them to leave the institution. In his presidential address he remarked: You have tried all sorts of things to ameliorate your troubles. Now try just one device suggested by Muhammad (May peace be upon him), who

States. Maulavi Zafar Ali Khan presided on the occasion and Iqbal expressed resentment against the attitude of American government, who were sensitive to the propagation of Islam because according to them it was a religion which clashed with the established law of the country prohibiting polygamy. (Reported by Professor Hamid Ahmad Khan, who was present in the meeting).

Iqbal Contests Legislative Council Seat.

October 11, 1926: In a public speech during his election campaign for the membership of Punjab Council, Dr. Iqbal said : I assure you I will never put my personal interests before the national interests. (Original preserved in the Zamindar, Oct. 14, 1926).

October 15, 1926 : Malik Muhammad Husain presided at a meeting held in Mochi Gate and Dr. Saif ud Din Kitchlew supported Allama Iqbal, who addressing the public, said : This morning a delegation led by Mehr Suba approached me to request that I should withdraw in favour of Malik Muhammad Din. I told him that he could be the representative of Muslims, on whom they agree. We should rise above caste and break its idol like Ibrahim, I am soon going to launch a social programme for the youth. (The Zamindar. October 23, 1926).

January 22, 30. 1927. When Hindu newspaper, *Pratap* and *Milap* started poisnous vituperation against Muslims and Islam, after the murder of Swami Shardhanaued. Dr. Iqbal presided at two public meetings held in Mochi Gate Gardens on the above mentioned dates and preached for Hindu Muslim unity in his

Iqbal—A Mochi Gate Awami Leader

It cannot be definitely ascertained as to when Allama Iqbal appeared as an *Awami* leader in Mochi Gate Gardens, but some of the land-marks, gleaned from the contemporary extant records, are as follows :

February 1, 1911 : In a public meeting held in Mochi Gate Gardens, to protest against the cancellation of the partition of Bengal, Dr. Sheikh M. Iqbal was voted to the Chair, but on reaching the dais he proposed the name of Malik Mubariz Khan Tiwana in his ..... place and requested him to take the chair. This was agreed to and Mr. Tiwana presided. Iqbal recited a few verses of the first *ruku* of the *sura* a *Dahr* and inaugurated the proceedings commenting on the resolution moved by Maulavi Ghulam Mohi ud Din Kusuri, Iqbal exhorted the Muslims to stand on their own legs to achieve ideals preached by Islam (Original extracts of Iqbal's address published in the Daily Zamindar, Feb. 4, 6, 1911).

Jawab-e-Shikva.

1912 : It was in Mochi Gate gardens that Iqbal recited his *Jawab e Shikva* for the first time on the insistence of Maulavi Zafar Ali Khan, who presided on the occasion (Reported by Professor Hamid Ahmad Khan, who was present in the meetings).

1912 : Iqbal presided at a protest meeting held in Mochi Gate gardens against the refusal of United States of America's government to admit an Ahmadi preacher, Maulavi Taj-ud-Din Ahmad Mujadedi Naqshbandi, son of famous Mulla Hunter, to propagate Islam in the

by a moat and other defences. The ruins of this wall, which was formerly 30 feet high, can still be seen at places near the Circular Road. which runs a length of nearly four miles in a circuit round the city. The access to the city was gained by thirteen gateways, out of which one is known as Mochi Gate. The name is a corruption of Moti, a pearl. It was named after Moti Ram, an officer of Akbar, who resided here at that time, and, according to others was put here on duty as on officer to guard the gateway. On the entrance to the gateway two domes were also built, probably to lodge the guards. The city wall of Akbar was fast falling into decay, when Ranjit Singh to a great extent rebuilt them, in 1812, and surrounded it with a deep broad ditch mote faced with bricks and the earth thrown inwards, so as to form a wide rampart with bastions of great strength at intervals.

Sometimes after 1849, when the British occupied the city, the gateway, along with its towering domes, were pulled down. The city wall was also reduced to 15 feet's height for sanitary purposes.

Lahore Municipality.

The constitution of the Municipal Committee sanctioned for Lahore was published in Notification No. 704, dated April 2, 1862. The first annual report of this Committee, submitted to the government in Urdu in 1863, shows that Rs.4,387 were expended on filling up the city ditch and converting part of it into a garden to be irrigated by a branch of Bari Doab Canal. Thus the Mochi Gate Gardens came into being in 1863-64.

Iqbal in Mochi Gate Gardens

Like all other famous men of his time Iqbal used Mochi Gate Gardens, in Lahore, as a venue of his public addresses. These gardens the well-known amphitheatre of Muslim political, social and cultural gatherings, assumed historical importance in the early twentieth Century of Christian era, and continue to enjoy popularity till the writing of these lines.

Mochi Gate

Lahore formerly covered a far larger area than it does at present. It is apparent from the extent of the ruins of old buildings. Some local authorities, however, are of the opinion that at no one time was the vast extent, which the remains indicate, covered by an inhabited city. But that the inhabited area has greatly shrunk is evident from the fact that of 36 *guzars* or quarters into which Lahore is known to have been divided during Akbar's time (1556 1605 A.D.), only 9 are included within the area of the walled city, and only a few others now exist with their old names.

Akbar, during his residence at Lahore (1584 to 1598 A.D.), besides constructing numerous quarters, streets, and bazars, and a fort also built wall of considerable height and strength to enclose the city. It was fortified

The time has come when, instead of quibbling on the words of 'social democracy' (without capital s and d) and 'Islamic socialism' (without capital s), we should apply our minds to exploiting the limitless possibilities of evolving an ideal social structure in Pakistan as advocated by Iqbal and Jinnah.

(*The Pakistan Times, April 21, 1972*)

———

equalisation of taxation involving the imposition of additional taxes on large land-owners.

Again it was the same sentiment which prompted the Quaid-i Azam to address the Pakistan Government officers at Karachi on October 11, 1947, when, discussing the economic pattern of Pakistan, he remarked : "the idea was that we should have a State in which we could develop according to our own light and culture and where principles of Islamic social justice could find free play."

He elaborated the same idea when, in a speech at a public reception at Chittagong on March 26, 1948, he expressed his view regarding the social and economic content of freedom in Pakistan, by saying : "You are only voicing my sentiment and the sentiments of millions of Mussalmans when you say that Pakistan should be based on sure foundations of social justice and Islamic socialism, which emphasis equality and brotherhood of man. Similarly you are voicing my thoughts in asking and in aspiring for equal opportunities for all. These targets of progress are not controversial in Pakistan, for we demanded Pakistan, we struggled for it, we achieved it so that physically as well as spiritually we are free to conduct our affairs according to our traditions and genius. Brotherhood, equality and fraternity of man—these are the basic points of our religion, culture and civilisation. And we fought for Pakistan because there was a danger of denial of these human rights in this sub-continent. We aspired for these great ideals because of centuries of dual domination by the foreign rulers and by a caste-ridden social system."

elections on the issue of Pakistan, the leadership sought assistance of the 'mullas', 'pirs' and other religious leaders. All persons opposed to the League were described by them as enemies of Islam, because it was widely propagated that Pakistan would be an Islamic State drawing its inspiration and guidance from the Quran and the traditions of the Holy Prophet (may peace be upon him).

Letter to Quaid

But earlier than this a small group of Muslim intellectuals, who were concerned about the future social and political set up of Pakistan, was thinking on the right lines. Iqbal being the leader of the contemporary thought, had suggested very vividly in a latter to Quaid-i-Azam written in 1938 that social democracy in some suitable form and consistent with the legal principles of Islam is not a revolution but a return to the original purity of Islam. This was a clear indication of the fact that Iqbal laid great stress on Islam's dynamism. But this dynamism, although it envisaged economic planning to bring about a just distribution of wealth, yet rejected Marxian materialist dialectics, as well as Soviet totalitarianism as antithetical to Islam.

It was this seed of thought of planning a better economy for the common man which grew and flourished when the Punjab Provincial Muslim League, in its manifesto published in 1944, declared that there should be nationalisation of key industries and banks, beginning with immediate nationalisation of all public utility services, public control of private industry, a ceiling placed on land holdings, and an

Iqbal—On Social Democracy

With the advent of the twentieth century the rationalist Indo-Pakistan Muslims had already started giving a serious thought to the fact whether or not it was rewarding to stick to beliefs expounded by the hidebound 'mullas'. With a heart full of love for Islam and at emper influenced with religious fervour they began questioning the authority vested in the religious hierarchy, which according to Islam was not permissible.

Syed Mehdi Ali a product of the 1857 War of independence, declared in 1906 that the Sultan of Turkey was not to be considered Khalifa of the Indian Muslims. Another writer, Chiragh Ali, who wrote mostly in English, and whose pen had much controversial force, endavoured to show in his book, 'Proposed Reform' that Mohammedanism as taught by Mohammad possesses sufficient elasticity to enable it to adapt itself to the social and political revolutions going around it. He said that the Quran was not a barrier to political, social or moral innovations.

But, somehow or other, this type of nationalist movement did not continue for very long. And early in the middle of the century, when the All India Muslim League campaigned in the

cultural heritage and a common aspiration of an ideological polity. I am one of those who refuse to accept there is nothing in common between the peoples of the two Wings of the country. What is needed is a sympathetic understanding of each other's aspirations and needs an early removal of a sense of discontent and frustration bred and nurtured upon the basis of glaring disparity in the pace of economic development of the two Wings of the country."

The writer feels while this remedial formula is certainly to be applied to the situation existing between the two wings, it has broadly to be applied to groups of human beings with varying degrees of affluence, or shall we say indigence, all over the country, in order to create a sense of common nationality and herd-instinct, for, again according to the rationale of this learned judge, "with planned economic development of every part a new sense of national cohesion and solidarity is bound to develop and pave the way for political integration as well."

(*The Pakistan Times, April 21, 1968.*)

———

achieved Pakistan, and thus you can place Quaid-i-Azam on top of the list of most perfect leaders bestowed upon us. It cannot be denied that we were also lucky to have leaders who possessed a keen perception of the spirit and destiny of Islam and equally keen per ception of the trend of modern history, but again it cannot also be denied that after achievement of Pakistan, something happened to us that we drifted away from "the main objective for which Pakistan was sought and won", which according to the most learned and precise elucidation of Mr. Justice Hamood-ur Rahman (Reflections on the Constitution ; P. T. April 1 — 2, 1958) "was that the Muslims of this subcontinent should have a place where they can be free to lead a life in accordance with the teachings and requirements of Islam."

Herd-Instinct.

Probably one obstacle in the way of achieving this objective was the lack of herd-instinct, which for a short time was inculcated and culminated in the creation of Pakistan, but soon after started dwindling. Again this herd-instinct cannot exist in an abstract mode. It represents the aspirations and will of the people and it grows, develops and dwindles with the material, moral and spiritual circumstances of a society. It fosters unity and brotherhood, engenders respect for leadership and offers the means through which differing groups of peoples may unite while retaining their own individualistic existence, homes and hearths. Justice Hamood-ur-Rahman has given a message of great hope when he says : "There is no reason why this should not happen in Pakistan. We have many things which bind our peoples together such as a common religion, a common spiritual and

that Goethe said while making a general review to Eckerman : You see this teaching never fails ; with all our systems, we cannot go, and generally speaking no man can go, further than that" (*Lectures, p.* 9)

Now let us consider the second evil from which according to the vision of Iqbal the Muslim community was suffering. In the same address of 1930 at Allahabad Iqbal said :

"The second evil from which the Muslims of India are suffering is that the community is fast losing what is called the herd instinct. This makes it possible for individuals and groups to start independent careers without contributing to the general thought and activity of the community."

Iqbal has written scores of verses explaining the benefits of national unity and single mindedness of purpose and has on a number of occasions condemned selfish attitude of the individual who turns his back to the 'millat' to advance a personal cause. But this he did way back, when he was dreaming of a separate home land for Muslims of the subcontinent. He has not been even midst us since the last 30 years and during the last 21 years when his dream came true in the form of Pakistan. The question naturally arises how far we have adhered to the ideals of this great benefactor of the Muslims of the sub-continent and how much we have achieved in the line of his thoughts He has unequivocally laid down the specifications of leaders required by Muslims and you will agree with me that we are fortunate to have leaders both as a gift of God and matured by experience. If it was not so we could not have

"Concentrate on the very obvious signs, so that you may capture the modern world."

What Iqbal considered to be the 'spirit of Islam' is obvious, from his comments, which he made during his address to a Muslim audience in Madras in 1929 :

"Muslim has always adjusted his religious outlook to the element of culture which he assimilated from the peoples that surrounded him From 800 to 1100, says Horten, not less than one hundred systems of theology appeared in Islam, a fact which bears ample testimony to the elasticity of Islamic thought as well as to the ceaseless activity of our early thinkers. Thus, in view of the revelations of a deeper study of Muslim literature and thought, this living European Orientalist has been driven to the following conclusion :

'The spirit of Islam is so broad that it is practically boundless. With the exception of atheistic ideas alone it has assimilated all the attainable ideas of surrounding peoples, and given them its own peculiar direction of development.' (*Lectures, p.* 164.)

Iqbal also lays down that a real leader of Muslims should have a keen perception of the destiny of Islam. Dwelling upon this subject, on numerous occasions in his poetry and prose, Iqbal discussed the innnite possibilities, which are still hidden in the depths of Quran and again in his lectures he remarked :

"The main purpose of the Quran (and we may add : of Islam) is to awaken in man the higher consciousness of his manifold relations with God and the universe. It is in view of this essential aspect of the Quranic teaching

Dwelling upon this theme Iqbal also gave the specifications of leaders of Muslim community :

"By leaders I mean men, who by Divine gift or experience, possess a keen perception of the spirit and destiny of Islam, alongwith an equally keen perception of the trend of modern history. Such men are really the driving forces of a people but they are God's gift and cannot be made to order."

Propagation of these specifications of a real leader of Muslim community, which he variously styled as Mard-e-Hur, Banda-e-Momin, Mard-e-Kamil and Mard-e-Haq Agah, was a life-long passion with Iqbal and he never despaired of telling his people :

چناں با ذات حق خلوت گزینی
ترا او بیند و اورا تو بینی

بخود محکم گذر اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحر نورش

" You must associate with God in solitude so that He sees you and you see Him.

Be firm in His presence and don't merge yourself in the ocean of His light."

حفظ قرآن عظیم آئین تست
حرف حق را فاش گفتن دین تست

(جاوید نامہ ۹۵)

To follow the Holy Quran is your law and to propagate the word of God openly is your religion.

دل بآیات مبین دیگر ببند
تا بگیری عصر نو را در کمند

Leaders As Envisaged By Iqbal

While Iqbal's historic presidential address at the Allahabad session of the All-India Muslim League, on December 29, 1930, emphasised the redistribution of British India, as a permanent solution of the communal problem it also impressed, upon the Muslim community the importance of doing some honest heart-searching and to set their home in order for achieving this solution.

Unfortunately this part of his address is relegated to oblivion, although after the fruition of a part of his suggestions, namely the establishment of Pakistan, Pakistanis constantly need reminding themselves the shortcomings pointed out by the greatest Muslim thinker of his times, when he remarked in his address :

"Let me tell you frankly that at the present moment, the Muslims of India, are suffering from two evils. The first is the want of personalities."

Admitting liberally that the comments of his two foreign rulers and contemporaries were true he added, "Sir Malcolm Hailey and Lord Irwin were perfectly correct in their diagnosis when they told the Aligarh University that the community had failed to produce learders."

"The wisdom contained in that eternal book, Quran-e-Hakim, is unfading and olden. It is an archetype of the secrets of life's genesis from whose strength the infirm derives firmness It is the last message to the human race delivered to it by the Holy Prophet (Forgiveness of the worlds)."

Today when we are celebrating the twenty-eighth death anniversary (and why don't we celebrate the birth anniversary ?) of the late Allama Iqbal, all over Pakistan, and even in some other countries, we have to ask a simple question from ourselves. Have we at all cared to practise what Iqbal preached ? His preachings were original but not new. He simply aimed at the restitution of the ideals of pristine Islam, devoid of all later additions and interpolations from Hellinistic, Persian and even Hindu sources. Before the establishment of Pakistan we shouted from the house tops.

Pakistan ka matlab kya ? La elaha il-lallah
"What is meant by Pakistan ?
There is no god but God !"

Have we stuck to this slogan ? If no what is being done in our society to bring home to us the dangers of fleeing away from realities and the message of Iqbal ? If the preaching of Iqbal and the spirit of this slogan is lost to oblivion there can be no hope for tomorrow. We are paying homage to a guide by lip service which is probably not a very honesnt attitude of mind.

(*The Pakistan Times, April 21, 1966*)

work, I think I could not offer a better present, to the Muslims of the world, than these notes on the Quran-e-Karim" (Iqbalnamah, 358).

He reiterated his desire in his letter of May 30, 1935, when he said : "I wish I could record my views about the Quran-e-Karim before I die" (Iqbalnamah, 361).

This wish was never realised, but in order to keep the Islamic ideals alive in the country Iqbal propagated throughout his life that a real effort had to be made to dispel the scepticism towards Islam, which was deeply embedded in the minds of the ignorant people. He very bitterly remarked in 1924 : Muslims are now, from the intellectual point of view, in the state of Europe in the time of Luther : but in the Islamic movement there is no personality as leader (Maktubat, I, 143).

The poet often complained of his intellectual loneliness in the contemporary society calling himself the "first Adam of a new world" (Zabur-e-Ajam, 37). He also complained of the difficulty of his position while he was struggling against heavy odds to convince the Muslims to revive an unflinching and unassailable belief in the tenets of the Holy Quran. Yet he kept the torch burning with an unrivalled fervour as he firmly believed that

An Ketab e Zindah Quran e Hakeem
Hekmat e oo la yazal ast o qadeem
Noskha e asrar e takveen e hayat
Be sabat az quvvatash girad sabat
Nau 'e insan ra payam e akhereen
Hamel-e-oo Rahmatul Lel 'Alameen

and fervour of his love for Islam as an ideal which if fully realised should suffice for man's every want in this world and the next. According to the estimate of Ferrar the wide reading and poetic temperament of Iqbal had created in his mind so attractive and so inspiring a picture of the simplicity, the force and the appeal of early Islam that his main pre-occupation centred round a return to that simple creed in order to regain what he believed Islam had lost.

Iqbal had very carefully studied the political-cum-social movements, in vogue in the so-called more civilised and advanced contemporary world of Europe and other countries and denounced all these movements (in 1934) by saying : "Fascism, Communism and all the isms of this age are nothing real. In my conviction only Islam is the one reality which can become the medium of salvation for human beings from every point of view." (Maktubat II, 314).

Importance of Holy Quran.

The importance of studying Quran is repeatedly preached by Iqbal in prose and poetry and, in fact, his last ambition, to achieve this ideal, was to write a book on the Holy Quran. In a letter addressed to Sir Ross Masud, on April 26, 1935, he very despairingly remarks :

"Thus it would have been possible for me to complete in the light of the modern thoughts, which are for a long time under my consideration, my notes on the Quran-e-Karim. But now I doubt very much if I shall ever be able to achieve this. If I could be afforded the little time, now left at my disposal, to devote to this

Iqbal—An Advocate of Islamic Values

A FIRM believer in 'Ijtehed' (the principle of movement in the structure of Islam), but unrelentingly uncompromising, where Islamic values of life were concerned—that is what Iqbal was. He thought it was quite in order to exert one's mind to form an independent judgment on moral, legal and ethical questions, but in Islam, according to him, the spiritual and temporal were not two entirely separate and distinct domains, and the nature of an act, however secular in its import, was determined by the attitude of mind with which the agent did it. The agent, in all circumstances, was to be guided by the tenets of Islam.

"The ultimate Reality," he said, "according to the Quran, is spiritual, and its life consists in its temporal activity". He believed that the spirit found its opportunities in the natural, the material and the secular. To him Islam was the most rational religion and the Holy Prophet Muhammad (May peace be upon him), the greatest man ever born on the face of earth. Iqbal's message and the whole philosophy of this message was based on these considerations, which pervaded all his poetical compositions of substance. Some years back Lt.-Col. Ferrar truly remarked about Iqbal in his "Whither Islam" (p.204) : The strength

animals and beasts and I am looking for a human being :

My heart is aching on account of these fellow-travellers with lazy elements.

I am in search of Lion of God and famous Rustam.

I said : We have tried to find (such a person) but have failed. He said ; I desire only for the person who cannot be found.

He cajoled the intellectuals of the community and finally gave the idea of self-determination to the Muslims of this sub continent. which, in fact, was projection of Rumi in realising 'self' for material advancement But it must be repeated that Iqbal did not stop at Rumi. He went still further and made it a mission of his life to help awaken the spirit of his countrymen, who were either forced to accept a slumber through political slavery or were so down-trodden that they could not raise their head against oppression. Thus the Indian Muslims shall always remain indebted to Iqbal, who took his inspiration from Rumi.

(*The Pakistan Time October 18, 1963*)

———

from God, the lesser his individuality. He who comes nearest to God is the completest person, Not that he is finally absorbed in God. On the other hand he absorbs God in himself. The true person not only absorbs the world of matter, by mastering it he absorbs God Himself—Life is a forward assimilative movement. It removes all obstructions on its march by assimilating them. Its essence is the continual creation of desires and ideals, and for the purpose of his preservation and expansion, it has invented or developed out of itself certain instruments, e.g., senses, intellect, etc., which help to assimilate obstruction—The ego attains to freedom by the removal of all obstructions in its way. It is partly free, partly determined and reaches full freedom by approaching the individual who is most free—God."

Thus we find Iqbal is not only absorbing influences from Rumi but he also projects Rumi with an eye to the conditions of Muslims living in the Indo-Pakistan sub-continent.

When Iqbal started writing his verses Muslims in India were going down on the steep that they had accepted as their destiny after the fall of the Mughul Empire. The British had evolved a policy by which they wanted to keep in tight shackles the hitherto rulers so that they should completely forget all about their hey day. Thus it was a very depressing time when Iqbal started commenting on the situation and get inspiration from the world famous sayings of Rumi."

"*Yesterday the Sheikh went round the town with a lamp, (saying) that I am fed up with*

rous stories in Rumi which aptly illustrate this method, and which he himself describes as :

> *"O brother, the story is like a measure : the real meaning in it resembles grain (in the measure). The man of intelligence will take the grain of meaning : he will not pay any regard to the measure, even if it is removed (altogether)."*

To start with Iqbal directly borrowed the story of the "Lion and Goats" from Rumi in his *Asrar-i-Khudi*, when he wanted to propound the theory that the weak and subject races weaken their masters by preaching them to eat, drink and behave like themselves. He then employs this technique by narrating numerous stories, both historical and imaginative, to convince the reader of his argument, with the difference that he confines himself to the subject of Islam and Muslims in this book and his subsequent writings.

Rumi's entire philosophical thought is an eloquent plea for a life of strenuous activity and endeavour for creative self-expression to attain heights of power. He is emphatically opposed to pseudo-mysticism, seclusion, passivism and inactivity. Iqbal was impressed with this idea and further developed it by urging the people to strive hard to achieve the completion of man.

In his letter to Professor Nicholson, Iqbal wrote:

> *"Physically as well as spiritually man is a self-contained centre, but he is not yet a complete individual. The greater his distance*

Iqbal and Rumi

Rumi was born in 1207 A.D. and died in 1273 A.D. Thus Iqbal flourished a little over six hundred years after Rumi. If we are to have some idea of Rumi's influence on Iqbal it is essential to know the contributions of Rumi to thought.

Again we have to keep in mind that Rumi did not take upon himself the mission of systematising and broadcasting his thoughts and message. He was essentially a poet and a thinker and like all great artists he painted a huge canvas of poetry, transferring all that occurred to him. As Whin field points out, the *Mathnavi* is an exposition of "experimental" mysticism, and not a treatise of "doctrinal" mysticism. Hence Rumi does not set out all this Sufi gnosis with the logical precision of a systematic thinker but rather assumes it all as known to his readers.

But it is not the mysticism of Rumi that influenced Iqbal. Iqbal, in his own times, had his own problems, for which he wanted to present the nation with a solution. Thus Iqbal, in the first instance, was enamoured of the technique of Rumi, which he employs forcefully in his *Mathnavi*. It is a very simple and effective technique, and is based on the psychological treatment of the subject by employing analogies to drive home a subtle point. There are nume-

"When the Faith and State are separated
Then only Greed ruled and Greed advised.
Separation doomed State and Faith ;
Separation is blindness caused by civilisation."

(ii) Iqbal pleaded for a government based on religion and restoration of Khilafat. This conception is based on the faith that the earth belongs to God and man is here to act as vicegerent to God.

The question which faces us today is how the conception of State envisaged by Iqbal can be translated into action. We have once seen the constitution of Islamic Republic of Pakistan collapsing under the political stress. Do we want to try it again in some other form Only legists can answer it satisfactorily. But it remains a fact that any constitution or form of government, which divorces itself from Islam or the conception of Iqbal will not flourish because once we cut ourselves from Islam there remains no reason for us to have a separate state in the sub-continent as a home for Muslims. The conception and achievement of Pakistan were based on the only idea of self-determination for Muslims and we have no continue to keep this philosophy alive if we want to keep ourselves alive. But again it must be remembered lip service to this ideal will also not save us. Islam in practice is faced with a great challenge and we have to accept it if we mean business.

(The Pakistan Times, April 21, 1961)

'جرہ شاہیں تیز چنگ و زود گیر!
صعوہ را در کارہا گیرد مشیر

"The experienced and powerful dictator ;

Builds around himself a fort of ordinances.

Then the sharp-clawed and swift-swooping Eagle;

Picks up the sparrow as adviser for his affairs."

The question naturally arises if Iqbal does not favour any existing forms of government what is it that would satisfy him. Now that the constitution of Pakistan is once again on the anvil it seems worth-while to give a serious thought to the problem and see if anything in line with the thought of and on the pattern envisaged by Iqbal, could be evolved. Iqbal did not live long enough to see the creation of Pakistan, otherwise he would have certainly helped in solving the problem or at least giving some advice as to how to crystalise the ideas he had preached with regard to the form of a desirable government. Here only his recommendations can be narrated briefly as follows :

(i) Iqbal believes that separation of politics from religion will lead to a chaos :

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری!
دوئی ملک و دین کے لیے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری

زانکه حق در باطلِ او مضمراست
قلبِ او مومن دماغش کافراست ،
غربیان گم کرده اند افلاک را
در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک
جز به تن کارے ندارد اشتراک

"The author of Capitalism (Karl Marx), a descendant of Khalil,

Was a prophet without Gabriel ;

And his heart was that of a believer, while his mind was that of a heretic.

The Westerners have lost the heavens,

And they seek purity of soul in bellies.

The purity of soul does not flourish through fattening a body,

And Socialism only looks after the body."

Iqbal has equally condemned dictatorship, because dictatorship is based on individual vigour and wisdom and does not get inspiration from religion and established laws of morality. Again when a dictator gets into power he builds around himself a fort of ordinances and picks up his advisers out of the weaklings, who have neither the wisdom nor the courage to speak the truth and enforce justice for the benefit of the ruled:

قاہرِ آمر که باشد پخته کار
از قوانین گردِ خود بندد حصار

Iqbal also feels that democracy is another garb of autocracy. Formerly, kings used to rule over the people, but now a group of people, after gaining power, exploit the people. Thus the condition of the ruled does not change. Whether there is one ruler or a number of rulers the ruled will be always deprived of their basic human rights ;

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

"The democratic system of the West is the same old organ,
Which pours out nothing but the Caesar's song.
The devil of Autocracy is dancing in garments of Democracy,
While you think it is the Blue Angel of Freedom."

Iqbal was somewhat attracted towards Socialism and had soft corner for it so far as it helped in setting up a system in which poor man's lot was improved. But discovering that Socialism was divorced of religious feelings he condemned it also. He expressed the feeling that Socialism only sought to give equal food to all bellies and beyond this it had no function to perform :

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل[۳]
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

نسخهٔ بهرِ شهنشاهان نوشت
در گلِ ما دانهٔ پیکار کشت

"When heresy tore the garment of religion,
A prophet of Devil appeared.
He was that wrong-loving Florentine.
Who injured the eyes of people with his collyrium.
He wrote a guide for the emperors,
Thus sowing a seed of war on earth.

Iqbal is also opposed to so called democracy. He feels genius, intellect and worldly experience does not necessarily find full appreciation in a democratic form of government, which is composed of vote-catchers :

گریز از طرز جمهوری ، غلامِ پخته کارے شو
که از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

"Discard democracy and tie yourself to a wise person,
Because two hundred donkey brains cannot produce a single human thought."

Iqbal believes democatic form of government is a system in which heads are counted without having an estimate of the capabilities of these heads. Voters may decide an important matter by counting heads rather than weighing :

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

"Democracy is a form of government in which Heads are counted and *not assessed."*

A Study of Iqbal's Thoughts on Governmental Forms

Iqbal was essentially a thinker and not a politician, with the result that he expressed his views about various forms of the governments in vogue and left it to the people to decide for themselves the form they liked best. In fact he did not leave much behind to choose from, as he was not only critical of most of the contemporary forms of governments, he almost condemned all of them, and yet he was quite anxious to suggest what should be the ideal form of government for people professing Islam.

Autocracy is labelled as *iblisi nizam* (Devil's system) by Iqbal and he thinks this system was responsible for driving mankind from religion and morality, and establishing slavery. Niccolo Machiavelli (1469-1527) the Italian statesman and author, who in his *Principe* wrote a guide for the perfect autocrat, comes first of all under fire ;

دہریت چون جامۂ مذہب درید
مرسلے از حضرتِ شیطان رسید

آن فلارنساوئ باطل پرست
سرمۂ او دیدۂ مردم شکست

worked their way up by sheer hard work and made the world follow them :

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہاں تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز!
جوشِ کردار سے تیمور کا سیل بہہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز

(*The Civil & Military Gazette, April 21, 1955*)

The result has been a complete stagnation of the society to whom he has been preaching for the last few centuries. While other people have been marching along with the times the Muslims have given themselves up to inertia, without making any progress in any direction. And this inertia has brought the downfall of the Muslims all over the world :

آسیا آن مرز و بوم آفتاب
غیر بین ، از خویشتن اندر حجاب !

قلب او بے واردات نو بنو
حاصلش را کس نگیرد بادو جو !

روزگارش اندرین دیرینہ دیر
ساکن و مخ بستہ و بے ذوق سیر !

صید ملایان و نخچیر ملوک
آبوے اندیشہ او لنگ و لوک !

Iqbal has also severely criticised and attacked the development of capitalism, and landlordism in the society. His heart goes out to the wretched worker who toils hard for the master and he suggests to him to work his way up in such a fashion that he can gradually get rid of the tactics of his fleecing master, but he does not advise him to agitate in fruitless way. He insists on development of his innate powers to combat with the evils prevailing in the society and to make himself strong and prepared for action, so that he could defeat the evil forces by honesty and hard work. He cites the examples of Napolean and Timur, who

امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاکباز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند!

ہمیشہ مور و مگس پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفتِ عنکبوت ان کی کمند!

Times have changed. Pakistan has been established. But the ways of the political leadership have not changed and the leadership is still creating a thousand and one Satans as Iqbal pointed out :

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس!

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس!

Besides the political leadership wrong type of religious leadership had proved a fertile ground for breeding various types of evils in the society. The ordinary leader, whom Iqbal symbolises as *Mulla*, established himself on a high pedestal in the society by creating rifts among the people. He was the most ignorant man in the society and yet claimed a position by advertising his omniscience :

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تری نماز میں باقی جلال ہے، نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام!

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

علم تا سوزے نگیرد از حیات
دل نگیرد لرزے از واردات!

ترا نومیدی از طفلاں روا نیست
چہ پروا گر دماغِ شاں رسا نیست
بگو اے شیخ مکتب گر بدانی
کہ دل درسینۂ شاں ہست یا نیست!

Wrong Leadership

In all ages and in all civilised countries political, religious and social leaders have been helping to alleviate the sufferings of the people. But in India and some Muslim countries leadership did not succeed in helping the people to any appreciable extent with the result that Muslims as compared with other 'millats' were much behind the times in all respects. Iqbal blamed leaders for their selfish motives and for their indifference to improvement of their national conditions. He firmly believed that political leaders were duping their followers irrespective of the latters' loyalty towards them or their station in life:

اس کھیل میں تعینِ مراتب ہے ضروری
شاطر کی عنایت سے تو فرزیں میں پیادہ
بیچارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ!

He was also very certain about the quality of leadership; the leaders posed to have lofty ideals but in reality they were very poor specimens of humanity:

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام !

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو !

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو !

اہلِ دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ !

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ !

Iqbal styles the teacher as an "Architect of the Soul of Man" and advises him to be optimistic about the younger generation, but he exhorts him to make sure that they have a real aim in life, as, according to him, the present education, without providing even for bread to the educated, is robbing them of their vitality. It was a sad commentary on the existing educational institutions and, indeed a gloomy picture of the means of education but when one honestly considers the progress of education in the independent State of Pakistan, one hangs his head in shame :

مکتب از مقصودِ خویش آگاہ نیست
تا بجذبِ اندرونش راہ نیست !

خشت را معمارِ ما کج می نہد
خوے بط با بچۂ شاہیں دہد !

Neither the young nor the old have been told to behave. Example has been conspicuous by its absence. The class or age of people have not proved a barrier or check against their misbehaviour as it happens in other civilised countries, where the evil practices persist only among bad classes of society or among people of unripe age. Iqbal noted lack of this education with great concern and struck a note of warning :

سر چشمۂ زندگی ہوا خشک
باقی ہے کہاں مئے شبانہ
خالی ہوا ان سے وہ دبستاں
تھی جن کی نگاہ تازیانہ

He was not satisfied with the formal education that the society was sponsoring. This probably. awarded degrees and diplomas, but did not educate mass of people attending schools and colleges. According to Iqbal, education that was being imparted to students created confusion in their minds without guidance regarding their future. He expressed disgust at the way teachers were conducting themselves. He likened them to a person who "was trying to light an electric lamp with a matchstick." The futility of the endeavours of the teacher and the taught was too obvious to be dealt with at length but the conclusion could definitelv be drawn that the society would not improve if the foundationstone of this society was not laid properly in educational institutions :

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام!

Just when Iqbal was expressing his disgust with one class of women and admiring another, he also probed into the causes that, according to him, had led to the deterioration of womanhood. He felt that intrinsically there was nothing wrong with the woman, but her following the West blindly and probably wrongly, had led her to this sad state :

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں!

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پروین

فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

And as he is very confident about the intuition and insight of woman, he finally leaves the matter for her to decide instead of suggesting any means of improvement :

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے، یہ قند

کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خردمند

Lack of Real Education

The basic training for the real education of morals and manners has been missing from our schemes since the advent of the British.

فکرِ او از تابِ مغرب روشن است
ظاہرش زن ، باطنِ او نا زن است

بندہائے ملتِ بیضا گسیخت
تا ز چشمش عشوہ با حل کردہ ریخت

شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش
از حیا ناآشنا آزادیش

علم او بارِ اموت بر نتافت
بر سرِ شامش یکے اختر نتافت

ایں گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

As I just said you may not agree with the criticism by Iqbal of the "social butterfly," but you will have to admit that the specimens of this womanhood do exist midst us and they have not proved very useful for society. Similarly, we do come across the picture of an ideal woman imagined by Iqbal and painted thus :

آں دخِ رستاق زادے جاہلے
پست بالائے سطبرے بد گلے

نا تراشے پرورش نادادۂ
کم نگاہے ، کم زبانے سادۂ

دل ز آلامِ اموت کردہ خوں
گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگوں

ملت از گیرد ز آغوشش بدست
یک مسلمانِ غیورِ حق پرست

taking inspiration from the Holy Book, he labelled women as the "garment" of man :

نغمه خیز از زخمهٔ زن سازِ مرد
از نیازِ او دوبالا نازِ مرد

پوششِ عریانیِ مردان زن است
حسنِ دلجو عشق را پیراہن است

عشقِ حق پروردهٔ آغوشِ او
ایں نوا از زخمهٔ خاموشِ او

He was not satisfied with the status that was granted by Muslims to woman :

مسلمے کو را پرستارے شمرد
بہرهٔ از حکمتِ قرآن نبرد

And discussing "apostasy" in his "Six Lectures" he very painfully remarked : "In the Punjab as everybody knows, there have been cases in which Muslim women wishing to get rid of undesirable husbands have been driven to apostasy. Nothing could be more distant from the aims of a missionary religion." Thus keeping a close eye on what was happening to Muslim women and how they were being treated by men. he also very severely criticised the chic gay-bird and dolled-up girl of society who refused either to bear and rear children or to share the burden of man in the sphere of national effort :

وان تہی آغوش نازک پیکرے
خانه پرورد نگاہش محشرے

خویشتن را ترک و افغان خواندهٔ ،
وائے بر تو آنچہ بودی ماندهٔ ،

قوم تو از رنگ و خون بالا تراست
قیمتِ یک اسودش صد احمراست

نیست از روم و عرب پیوندِ ما
نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردهٔ یک نوبہاریم

ہنوز از بندِ آب و گل نہ رستی
تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدمِ بے رنگ و بویم
ازاں پس ہندی و تورانیم من

Womanhood

Experiments all over the world have proved that much cannot be achieved in the field of social reforms if an adequate responsibility is not shared by the weaker sex in such enterprises. Iqbal was fully conscious of this fact and

himself endorsed this when he said; "The object of my Persian poems is not to 'plead' for Islam. Really I am keenly interested in the search for a better social order; and in this search it is simply impossible to ignore an actually existing social system the main object of which is to abolish all distinction of race, caste and colour."

Racial Distinction

Thus Iqbal sought all his life for a better social order in the existing social system that had been created by the followers of the Holy Prophet Muhammad (may peace be upon him). And out of the evils that had crept into this system the most obvious seemed to him to be the distinction of race, caste and colour, which Islam claimed to have abolished. This distinction according to him, had led to the establishment of geographical tribal and feudal barriers between Muslims of different countries as well as between Muslims of the same country. In an inspired expression, he proclaimed :

بر نسب نازان شدن نادانی است
حکم او اندر تن و تن فانی است

جوہر ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بومِ او بجز اسلام نیست

Iqbal—Greatest Islamic Social Planner

You may not wholly agree with what he had to say and you may not even agree with the remedies suggested by him to remove the evils prevailing in the society, yet it remains a fact that Iqbal was the greatest Islamic social planner of his times. He very carefully looked into the causes of the rot that was eating up the roots of society that had been set up by the people who styled themselves as Muslim and who claimed themselves to be the vicegerents of God on earth. His thinking prowess found expression mostly in poetry, which he used as a powerful vehicle of propagating his ideas and ideals. While his exalted intellectual powers, worked on the problems of the social evils that had crept into the society of the Muslims, he consciously and carefully established a basis for re-organising this society. The basis was the call "back to Islam" to the people who at least professed this faith, since he was convinced that Muslims had strayed from the right path because they had estranged themselves from Islam. Professor Nicholson in his preface to the "Secrets of the Self" has rightly remarked: "Holding that the full development of the individual presupposes a society, he finds the ideal society in what he considers to be the Prophet's conception of Islam." Iqbal

you may tell him that. All human beings are members of my family and I do not respect blood ties alone." Sir Abdul Qadir returned disappointed, but he cited this incident to me whenever narrow-minded Hindus dubbed Iqbal as a communalist.

(*The Civil & Military Gazette, April 21, 1953*)

———

of the journey to her and she was put in the train by Mirza Sahib. The girl was so much enamoured of the poet that she was willing to spend the rest of her life at his feet in any capacity, but Iqbal thought it to be an ungodly act to accept the offered servitude.

Iqbal was a man, who, to all appearances, looked very much attached to his family. He has composed remarkable poems expressing unlimited reverence for his mother, father and brother. Even for young Javed he has shown his tender feelings in very many affectionate ways. This was the human side of the poet which exhibited itself in a natural fashion.

He helped people even beyond his family circle, and there are living examples of some top-ranking persons in Pakistan who rose to high positions because Iqbal helped them in his own way. But as a man, who is distantly related to the late poet and who had some contact with him on intellectual level, I always found him placing merit above his blood ties. Whereas he would go all the way to the highest authority to recommend a deserving case he would not budge an inch to help an undeserving person, even if he was his own son. For instance, Sir Abdul Qadir went to him in 1936 and told him that one of his very near relatives was almost starving and a chit from him (Iqbal) to the local Governor would get him a lucrative position. Iqbal listened patiently to the plea and then said : "Sheikh Sahib, have you ever thought that many people like this relative of mine are 'killing' themselves for a pittance ? But they keep on working. This man wants to take advantage of my name, and he is not a gentleman. I have no sympathy for him and

ing. I had just forgotten it. I am grateful to you for having reminded me of this simple truth."

After this incident, Allama Iqbal never talked about the death of his wife in the pathetic way he used to formerly. Instead, for a number of the following days, he related the story of the poor orphan to his friends.

This was recounted by Mirza Jalal ud Din, the oldest friend and colleague of Iqbal alive, on Iqbal Day in 1951 at "Alhamra" (Pakistan Art Council). Iqbal used to live in Anarkali in his early career as a lawyer and Mirza Sahib used to call on him daily. One fine morning Iqbal received a letter from a young, talented woman from Meerut saying that she had passed her Munshi Fazil examination, and that with the fair amount of personal charm and intelligence that she possessed she would do very well as his wife. Iqbal showed the letter to Mirza Sahib and considering it to be a joke by some friend, forgot all about it. But the matter did not end there. As one day Mirza Sahib and Iqbal were sitting in Iqbal's office, the lady, clad in a 'burqa', walked in.

On inquiry it transpired that the woman had misconstrued the silence of Iqbal as acceptance of her offer and had now come to Lahore all the way from Meerut to strike the bargain personally. Mirza Sahib reports that the Poet of the East felt quite baffled over the situation. The woman was kept as a guest for a day or two and, eventually, she was persuaded to return to her town. But these two days were a great ordeal for the poet. He felt very sorry for the poor woman and paid all the expenses

after them ? Who will feed them ? Who will tuck them into bed?" And saying this he burst into tears passionately.

The Maulana remained quiet for a while and then slowly started: "Dr. Sahib, have you heard about those children who are being brought to different towns from Quetta ? They are victims of the earthquake and the identity of many of them cannot he established as some of them are so young that they can neither tell their own name nor the names of their parents." The poet suddenly fell interested in the havoc wrought by the calamity. His tears dried up and the Maulana continued : "We had a batch of these children in Sialkot a few days back. As we were trying to feed them on community lines, a young unidentified boy refused to take food and repeatedly shouted : Ayah, bring my spoon and fork. I will not have my food without my napkin. We were all, in tears and tried hard to persuade him to take his food but he would not listen to us."

Iqbal sat up on the 'charpoy' that he usually used to occupy at this stage of his life and said : "Maulana go on". "The boy", continued the Maulana, "had to be fed next day forcefully as on that day he had gone to sleep after fretting and fuming. Just imagine, you are still alive. If the mother of your children is dead they still have something to fall back upon."

Iqbal's eyes shone for a moment. Sitting near, I could see he felt a different man. In the colossal grief of others he had visualised the enormous smallness of his own grief and as the learned Maulana finished his harangue, Iqbal said : "Maulana, Faith means not worry-

Iqbal Was More Human Than Stress on His Philosophy Has Left Him

Quetta earthquake had converted the magnificent town into a heap of rubble and debris in 1935. The exact loss of life had as yet not been determined. Relief workers were making frantic efforts to save the life and property that had escaped the ravages of the earthquake. All sorts of news were reaching Lahore, the capital of the province, and people felt extremely sympathetic towards the bereaved persons who were now slowly trickling into the rest of the country, where fate or relief workers brought them. Iqbal, the great poet of the East in these days, was afflicted with a personal malady. His second wife, the mother of Javed and Munira, had recently died, and whenever a visitor called on him he poured out his heart with sobs, bemoaning the loss of the precious companion.

Maulana Ibrahim of Sialkot went to see him to offer condolence and "fatiha" for the departed soul and as the Maulana finished his prayer Iqbal dissolved in tears. The Maulana consoled him but Iqbal said crying: "Maulana, I am not worried about myself : I am only thinking of these two young children (thereby referring to Javed and Munira). Who will look

CONTENTS

1. Iqbal was more human than stress on his philosophy has left him 1
2. Iqbal-Greatest Islamic social planner 6
3. A study of Iqbal's thoughts on governmental form 18
4. Iqbal and Rumi 24
5. Iqbal-An Advocate of Islamic values 28
6. Leaders as envisaged by Iqbal 32
7. Iqbal-on social democracy 38
8. Iqbal in Mochi Gate Gardens 42
9. Iqbal on the Concept of Religion and Morality 48

Printed at
MATBA-E-ALIYA
120-Temple Road, LAHORE

Some Aspects of Life and Works of Iqbal